فہرست عناوین

پیش لفظ ۹

اسلام اور انسانی حقوق ۱۱

انسانی حقوق کا تصور اور اس کی تاریخ ۱۱

حقوقِ انسانی کا عالمی منشور ۱۲

اس منشور کی خامیاں ۱۲

اسلام کا نقطۂ نظر ۱۴

قرآن و حدیث میں انسانی حقوق کا بیان ۱۴

فقہاء کی تشریحات ۱۵

اسلامی قانون پر اعتراضات ۱۵

بعض راہ نما اصول ۱۶

حقِ حیات ۱۸

حقِ مساوات ۱۹

حقِ انصاف ۲۰

قانون کی برتری ۲۰

جرم عدالت سے ثابت ہوگا ۲۱

معاشی جدوجہد کا حق ۲۲

سماجی حقوق ۲۳

اظہارِ خیال کی آزادی ۲۴

خاندانی زندگی گزارنے کا حق ۲۴
خلوت کا حق ۲۵
ملکی وملی خدمات کا حق ۲۵
دفاع کا حق ۲۶
کم زوروں کے حقوق ۲۶
مذہبی آزادی کا حق ۲۷

کم زور کے مسائل اور اسلام ۲۹

کیا مذہب کم زور کا دشمن ہے ۲۹
کم زور کی وکالت ۳۰
کم زور کے حقوق کی حفاظت ۳۱
مسائل کا وسیع تصور ۳۲
کم زور افراد اور طبقات دونوں کی مدد ۳۳

کم زور۔ اسلام کی نظر میں ۳۵

پیغمبر خوش حال اور حکم راں طبقے سے نہیں ہوتے ۳۵
پیغمبروں کا خطاب عام ہوتا ہے ۳۶
کم زور طبقات پیغمبروں کا ساتھ دیتے ہیں ۳۶
کم زوروں نے آخری پیغمبر ﷺ کا بھی ساتھ دیا ۳۸

نظامِ شریعت میں کم زور کی رعایت ۴۳

ذمے داری بہ قدرِ استطاعت ۴۴
عبادات میں کم زور کی رعایت ۴۶

مالی ذمے داری بہ قدرِ استطاعت ۴۷
معذور پر جہاد فرض نہیں ہے ۴۸
صبر کی تلقین ۴۹

کم زور کی ظلم سے حفاظت ۵۳

اسلام سے قبل عرب میں کم زوروں کی حالت ۵۴
اسلام نے کم زوروں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی ۵۵
اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا ۵۶
اللہ تعالیٰ ظلم کو ناپسند کرتا ہے ۵۶
ظلم کرنے والوں کی مذمت ۵۷
طاقت ور کم زور پر ظلم نہ کرے ۵۸
حذر از آہِ مظلوماں ۵۹
ظلم کا انجام دنیا میں ۶۰
ظلم کا انجام آخرت میں ۶۲
آخرت میں ظلم معاف نہ ہوگا ۶۳
ظالم اپنے ظلم کی دنیا میں تلافی کرلے ۶۵
ظالم کا کوئی ساتھ نہ دے ۶۶
مظلوم کا ساتھ دیا جائے ۶۷
ظالم کو ظلم سے روکا جائے ۶۹
کسی گروہ کو ظلم کرنے نہ دیا جائے ۷۱
ظالم اور مظلوم دونوں کی مدد کی جائے ۷۷

مظلوم کے حقوق ۷۹

مظلوم ظلم کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے ۷۹

حق دار حق کا مطالبہ کرسکتا ہے ۸۲

حق کے ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے ۸۳

حق کے ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنے والا فاسق ہے ۸۴

حق کے نہ ادا کرنے پر سزا دی جاسکتی ہے ۸۵

نادار کا حکم ۸۷

کسی بھی حق کے ادا کرنے میں حیلے بہانے کی اجازت نہیں ہے ۸۹

قرض دار حوالہ قبول کرے ۸۹

انتقام کا حق اور عفو و درگزر کی فضیلت ۹۳

انسانی فطرت اور جذبۂ انتقام ۹۳

جذبۂ انتقام - اسلام کی نظر میں ۹۴

انتقام میں زیادتی کی ممانعت ۹۵

مالی اور جسمانی انتقام میں زیادتی نہ ہو ۹۶

زبان سے انتقام میں زیادتی نہ کی جائے ۹۹

انتقام میں حدودِ شریعت کی پابندی ۱۰۱

عفو و درگزر کا حق ۱۰۳

معاف کرنا پسندیدہ ہے ۱۰۳

عفو اللہ کے نیک بندوں کی صفت ۱۰۴

معاف کرنے والوں کو اللہ معاف کرتا ہے ۱۰۴

حدیث میں درگزر کی ترغیب	۱۰۶
غصہ پر قابو پانے کی فضیلت	۱۰۷
عفو و انتقام کی اہمیت موقع و محل کے لحاظ سے	۱۰۸
درگزر کرنا مظلوم کا اختیاری حق ہے	۱۰۹
خلاصۂ بحث	۱۱۰
کتابیات	۱۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

انسان اشرف المخلوقات ہے، لیکن یہ کتنا بڑا سانحہ ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں اس شرف و منزلت کو پامال کرتا رہا ہے۔ وہ خدا کا بندہ ہے لیکن اس نے خود سری اور آزادی کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ اس کی اصل ایک ہے اس لیے کہ وہ ایک ماں باپ سے پیدا ہوا ہے۔ اس کا فطری تقاضا ہے کہ بنی نوعِ انسان کو افراد خاندان کی طرح محبت والفت کے سایے میں زندگی گزارنی چاہیے، لیکن رفتارِ زمانہ کے ساتھ وہ بے شمار گروہوں میں تقسیم ہوگئے، بلندی اور پستی کے جھوٹے معیار قائم کرلیے اور ایک دوسرے پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش کرنے لگے۔ اسلام کے اس احسان کو دنیا فراموش نہیں کرسکتی کہ اس نے انسان کی عظمت بحال کی، ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان پائے جانے والے جھوٹے امتیازات ختم کیے، تقویٰ اور خدا ترسی کو معیارِ فضیلت قرار دیا، مساوات اور برابری کا سبق دیا، معاشرے کے ہر فرد کے حقوق متعین کیے اور ایک ایسا نظام قائم کیا، جس میں ان حقوق کی حفاظت ہوسکے اور کسی کو کسی کی چیرہ دستی کا شکار نہ ہونا پڑے۔

اس عاجز کو جن موضوعات سے دل چسپی رہی ہے، ان میں انسانی حقوق کا موضوع بھی ہے۔ اس نے اس سلسلے کی تحریروں میں کم زور افراد اور طبقات کے حقوق پر کسی قدر اختصار سے اور خواتین کے حقوق پر نسبتاً تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن موضوع کے بعض اہم پہلو ان میں زیر بحث نہیں آسکے ہیں۔ بعض پہلوؤں پر گفتگو ہوئی ہے، لیکن مزید وضاحت اور تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ پیش نظر کتاب میں اسی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب میں اس حقیقت کا بیان ہے کہ اسلام نے کم زور کے مسائل کا وسیع تصور دیا اور ان کے حل کے لیے ہمہ جہت اقدامات کیے، کم زور طبقات راہ حق کے اوّلین مسافر رہے ہیں، اس نے دین و اخلاق کی بنا پر سماج کے بگڑے ہوئے طبقات کے مقابلے میں انھیں عزت و احترام کا مقام عطا کیا، ان کی حقیقی کم زوریوں کی پورے نظامِ شریعت میں رعایت کی، ان کے اندر حالات سے نبرد آزما ہونے کا عزم و حوصلہ پیدا کیا، معاشرے میں ظلم سے نفرت اور ناگواری کے جذبات پیدا کیے اور اسے ختم کرنے کی تدابیر اختیار کیں، حق دار کو حق دیا اور اس امر کا اہتمام کیا کہ محض کم زوری کی وجہ سے کوئی شخص اپنے حق سے محروم نہ رہے، کم زور میں ظلم کا جواب دینے اور انتقام لینے کی جرأت پیدا کی، البتہ یہ حقیقت بھی واضح کردی کہ عفو و درگزر سے انسان اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دیتا اور اجرِ آخرت کا مستحق ہوتا ہے۔

کتاب کے شروع میں انسانی حقوق سے متعلق مختصر سی گفتگو ہے۔ اس میں مغرب کے نقطۂ نظر کی کم زوریوں اور اسلام کے امتیازات کو واضح کیا گیا ہے۔ اس کی روشنی میں کتاب کے مباحث کو بہتر طریقہ سے سمجھا جاسکتا ہے۔

کتاب میں موضوع کا مطالعہ اصلاً قرآن و حدیث کی روشنی میں کیا گیا ہے، البتہ اس کی تفہیم وتشریح میں جہاں ضرورت محسوس ہوئی، تفسیر، شروح حدیث، سیرت اور کتب فقہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے کتاب و سنت کی روشنی میں مسائل کا کتنی ژرف نگاہی اور باریک بینی سے جائزہ لیاہے۔ آج بھی اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

دعا ہے کہ یہ مختصر سی کتاب کم زوروں اور مظلوموں کے بارے میں اسلام کے موقف کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

جلال الدین عمری

۱۵/ مارچ ۲۰۰۷ء

اسلام اور انسانی حقوق

انسانی حقوق کا تصور اور اس کی تاریخ

انسانی حقوق کے بارے میں یہ تصور دیا جاتا ہے کہ اس کا احساس جیسے آج ہے، اس سے پہلے نہیں تھا۔ انسانوں کی اکثریت اپنے بنیادی حقوق سے محروم تھی اور ظلم کی چکی میں پس رہی تھی۔ کبھی کہیں سے کوئی آواز اٹھتی بھی تو طاقت ور طبقات کے مضبوط ہاتھ اسے دبانے میں کامیاب ہوجاتے۔ اس کی آزادی کا صحیح معنوں میں احساس مغرب کو ہوا اور مغرب ہی نے اس کا واضح تصور دیا۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس کے الفانسو شاہ نہم نے یہ قانون منظور کیا یا اس سے منظور کرایا گیا کہ کسی کو بلاوجہ قید نہیں کیاجاسکتا۔ دوسرے لفظوں میں حبسِ بے جا کو کالعدم قرار دیا گیا۔ اسے انسانی حقوق کی تاریخ میں بہت بڑا اقدام سمجھا جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد فرانس ہی میں روسو پیدا ہوا، اس کی کتاب کا اور اس نے انسانی آزادی کا جو تصور دیا اس کا بڑا چرچا رہا۔ اس نے کہا کہ انسان فطرتاً آزاد ہے اور اسے آزاد ہونا چاہیے۔ اس کتاب کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا اور یہ بڑی انقلابی کتاب سمجھی گئی۔ اردو زبان میں بھی اس کا ترجمہ 'معاہدۂ عمرانی' کے نام سے موجود ہے۔ اس کتاب کے بعد فرانس میں ایک طرح کی ہلچل پیدا ہوئی اور (Declaration of Rights of the Man) نامی اعلانیہ شائع ہوا، جس میں انسانی حقوق کا تذکرہ تھا۔

حقوق انسانی کا عالمی منشور

اس نوع کی اور بھی کوششیں جاری رہیں۔ ان کا عروج یہ تھا کہ ۱۰/ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ نے حقوقِ انسانی کا عالمی منشور (The Universal Declaration of Human Rights) منظور کیا اور اسے دنیا کے سامنے پیش کیا۔اسے اس سلسلے کا بڑا انقلابی قدم سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انسانی حقوق کا بہت ہی صاف اور واضح تصور اس کے اندر موجود ہے اور انسانوں کو ظلم و زیادتی سے بچانے کی یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔

اس منشور میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے:

(۱) فرد کی آزادی

(۲) عدل و انصاف۔ اور

(۳) مساوات

قانون کے ماہرین کے نزدیک یہ اس اعلانیے کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ اگر یہ تینوں چیزیں انسان کو مل جائیں تو اس کے حقوق محفوظ ہو جاتے ہیں۔

اس منشور کی خامیاں

اس منشور میں بعض خامیاں بھی ہیں اور عملی رکاوٹ بھی ہے۔ ایک یہ کہ یہ منشور منظور تو ہو گیا، لیکن اس کے پیچھے کوئی قوتِ نافذہ نہیں ہے۔ اگر کوئی ملک خاص طور پر کوئی طاقت ور ملک اس کی خلاف ورزی کرے تو اسے اس کا پابند بنانے کی کوئی ٹھوس اور موثر تدبیر اس میں تجویز نہیں کی گئی ہے۔ اس کا ثبوت آپ آج کی دنیا میں دیکھ سکتے ہیں کہ ایک بڑا ملک اپنی طاقت کے نشہ میں پوری دیدہ دلیری کے ساتھ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس میں مذہبی آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن اس آزادی

کے صحیح معنوں میں حدود متعین نہیں ہوئے ہیں۔ فرض کیجیے کہ اگر مذہبی آزادی کا تصور صرف یہ ہے کہ آدمی پوجا پاٹ کرے، عبادت گھر میں جا کے اللہ کی عبادت کرے، مسجد میں نماز پڑھ لے، چرچ میں اپنے مذہب کے مطابق دعا میں شریک ہوجائے، گردوارے میں یا جس کی جو عبادت گاہ ہے اس میں پہنچ جائے اور عبادت کے مراسم بجالے آئے تو یہ بھی ایک آزادی ہے۔ اس سے آگے بعض نجی اور خاندانی معاملات میں آزادی دے کر کہا جاسکتا ہے کہ یہ مذہبی آزادی ہے۔ آج مذہبی آزادی کا اس سے زیادہ کوئی تصور فی الواقع ہے بھی نہیں، لیکن اسلام کے معاملے میں مشکل یہ ہے کہ وہ پوری زندگی کے بارے میں ہمیں ہدایات فراہم کرتا اور ان کی پابندی کا حکم دیتا ہے۔ ایسا کوئی دستور نہیں ہے جو یہ کہے کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے تمام احکام پر چلنے کی آزادی ہے اور وہ اپنے دائرے میں اپنا قانون نافذ کرسکتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ مغرب میں کلیسا اور اس کے زیر اثر برسراقتدار طبقہ نے انسان کی آزادئ فکر و عمل اور اس کے بنیادی حقوق کے سلسلے میں انتہائی غلط رویہ اختیار کیا جس کا صحیح مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے ردِ عمل میں حقوق انسانی کا موجودہ تصور ابھرا۔ اس میں مذہب کے حقیقی رول کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اللہ کے جو پیغمبر دنیا کے مختلف گوشوں میں اور مختلف زمانوں میں آئے ان کی کیا تعلیمات تھیں، ان کو جب اقتدار ملا تو ان کا کیا رویہ رہا اور انسانیت کس طرح فلاح سے ہم کنار ہوئی ہے؟ یہ چیز کہیں زیر بحث نہیں آتی۔ جیسے یہ طے کرلیا گیا ہو کہ مذہب سے ہٹ کر یا مذہب کو نظر انداز کر کے گفتگو کی جائے گی۔ اس وجہ سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کوئی معروضی یا غیر جانب دارانہ مطالعہ ہے، صاف بات ہے کہ یہ جانب دارانہ مطالعہ ہے۔ جس میں پہلے سے طے کرلیا گیا ہے کہ مذہب کا حقیقی کردار زیر بحث نہیں آئے گا، بلکہ اسے نظر انداز کیا جائے گا۔

اسلام کا نقطۂ نظر

یہ ایک واقعہ ہے اور اسلام اسے تسلیم کرتا ہے کہ انسان پر ظلم و زیادتی ہوتی رہی ہے۔ انسانِ اوّل حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہی میں ایک بیٹے نے دوسرے بیٹے کا محض اس وجہ سے خون بہا دیا کہ اس کی قربانی اللہ کے دربار سے رد ہوگئی اور اس کے بھائی کی قربانی نے شرفِ قبولیت حاصل کرلی۔ لیکن اس کا ضمیر زندہ تھا۔ اسے بعد میں اس پر ندامت بھی ہوئی۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المائدۃ:۲۷-۳۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ظلم و زیادتی کو نہ روکا جائے تو ایک بھائی کے ہاتھ دوسرے بھائی کے خون سے رنگین ہوسکتے ہیں، اس لیے اسلام چاہتا ہے کہ ظلم و زیادتی کا ہر حال میں خاتمہ ہو اور کسی کو اس بات کی اجازت نہ ہو کہ وہ دوسرے کو جور وستم کا نشانہ بنائے۔ اس کے لیے اس نے ایک جامع اور مکمل قانون پیش کیا ہے۔ اس سے عدل و انصاف کے تقاضے ہر پہلو سے پورے ہوتے ہیں اور انسان کو وہ تمام حقوق ملتے ہیں جو اسے فی الواقع ملنے چاہئیں اور جن کی ضرورت کل کی طرح آج بھی ہے۔ یہ قانون متمدن دنیا کے بڑے حصہ پر صدیوں تک نافذ رہا ہے اور دنیا اس کا کامیاب تجربہ کرچکی ہے۔

قرآن وحدیث میں انسانی حقوق کا بیان

قرآن مجید میں احکام و قوانین کا ذکر مروجہ قانون کی زبان میں نہیں ہے۔ قانون کی کتابوں کی طرح ان میں ابواب اور دفعات کی شکل میں قوانین نہیں بیان ہوئے ہیں، بلکہ حالات کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً ان کا نزول ہوتا رہا ہے اور اسلام کی اساسی تعلیمات کے درمیان یہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ان میں سے کسی قانون کا بالعموم ایک جگہ بیان نہیں ہے، بلکہ اس کے ایک پہلو کا ایک جگہ اور دوسرے پہلو کا دوسری جگہ ذکر ہے۔ ان سب کو سامنے رکھنے سے قانون کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ یہی طریقہ اس نے انسانی حقوق کے بیان میں اختیار کیا ہے۔ پھر احادیث میں ان کی تفصیلات ملتی

ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس قانون پر کس طرح عمل ہوا۔ احادیث قرآن مجید کی سب سے مستند تشریح ہیں۔ احادیث سے ہمیں بعض نئے قوانین کا بھی علم ہوتا ہے۔

فقہاء کی تشریحات

اس کے ساتھ اسلامی قانون کی توضیح وتشریح کی علمائے امت نے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی قانونی وفقہی بصیرت کا انکار نادانی اور بے خبری کی دلیل ہوگی۔ انھوں نے جس ژرف نگاہی کے ساتھ اسلامی قانون کا مطالعہ اور تحقیق کی ہے اس کی نظیر آسانی سے نہیں پیش کی جاسکتی۔ متنِ قانون کے ایک ایک پہلو اور اس کے ایک ایک لفظ پر ان کے یہاں جو مباحث موجود ہیں اس سے قانون کے مختلف گوشے سامنے آتے ہیں اور قانونی دشواریوں کے حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اسلامی قانون پر اعتراضات

آج غیر جانب داری اور عدم تعصب کا چرچا تو بہت ہے، لیکن اسلام نے انسان کو جو حقوق دیے ہیں ان کا صحیح معنی میں اعتراف نہیں ہوتا۔ ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ آج انسان فکر ونظر اور تہذیب وتمدن کے لحاظ سے جس مقام پر پہنچ چکا ہے، صدیوں پرانا قانون اس کے تقاضے پورے نہیں کرسکتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلامی قانون کے ذریعہ بہت سے معاملات میں عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ لیکن یہ باتیں کسی تحقیق اور گہرے غور وفکر کا نتیجہ نہیں ہیں۔ اسلام کی اساسی تعلیمات اور اس کا پورا نظام فکر وعمل ان کی تردید کرتا ہے۔ اسلامی قانون کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آج جن حقوق کا چرچا ہے اور جن کے حصول کے لیے جدوجہد اور کشمکش جاری ہے، اسلام نے بہت پہلے ان حقوق کا واضح تصور ہی نہیں دیا بلکہ ان کے لیے قانونی ضمانت فراہم کی۔ انسان کے کسی ایسے بنیادی حق کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی جو اسلامی قانون نے اسے نہ دی ہو۔ یہ سب کچھ ان حالات میں ہوا کہ معاشرہ کے طاقت ور

افراد کو ہر طرح کے حقوق حاصل تھے اور کم زور کا کوئی حق نہ تھا۔ اس کے لیے کم زور کو کوئی جنگ یا کش مکش نہیں کرنی پڑی، بلکہ اسلام نے خود سے یہ حقوق اسے فراہم کیے۔

بعض راہ نما اصول

اسلام نے انسان کو جو حقوق دیے ہیں ان پر گفتگو سے پہلے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس کائنات اور انسان کے بارے میں اس کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے۔ اس کی بنیادی اہمیت ہے۔ اس کی بعض اصولی تعلیمات ہیں، جن سے وہ کسی قیمت پر ہٹتا نہیں اور اس کا کوئی قانون ان تعلیمات سے ٹکراتا بھی نہیں ہے۔ اگر آپ کوئی قانون وضع یا نافذ کریں تو آپ کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ وہ ان بنیادی تعلیمات سے متصادم نہ ہو۔ اگر وہ ان سے متصادم ہے تو اسلامی قانون نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے کہ اس دنیا کا خالق و مالک اللہ ہے۔ ہر چیز اس کی ملکیت ہے۔ یہ اس کا ایک بنیادی تصور ہے۔ اس تصور نے ہر ظالم اور ہر جابر کا اقتدار ختم کردیا ہے اور اسے بتادیا ہے کہ تم مالک نہیں ہو، مالک تو اللہ ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو اس حیثیت سے تسلیم کرتا ہے تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس اقتدار ہے، میں بادشاہِ وقت ہوں، کسی بڑی جائداد اور پراپرٹی کا مالک ہوں، لینڈ لارڈ یا صنعت کار ہوں یا میری کوئی اور حیثیت ہے، اس لیے جو چاہے کرسکتا ہوں۔ جب اصل مالک اللہ ہے تو انسان اس کی ملکیت میں اس کی مرضی ہی کے مطابق تصرف کرسکتا ہے۔ اللہ کی عطا کردہ قوت و طاقت یا وسائل و ذرائع کو اس کی مرضی کے خلاف یا اس کے بندوں پر ظلم و زیادتی کے لیے استعمال نہیں کرسکتا۔ ایک اور مثال لیجیے۔ خدا کے بارے میں اسلام کے عقیدے کا ایک لازمی جزو یہ ہے کہ موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب تک چاہتا ہے انسان دنیا میں رہتا ہے اور جب اس کی مرضی ہوتی ہے وہ چلا جاتا ہے۔ بعض بچے ماں کے پیٹ ہی میں مرجاتے ہیں۔ کوئی پیدا ہوتے ہی مرجاتا ہے۔ کوئی جوان ہو کے مرتا ہے،

کوئی بوڑھا ہوکر مرتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا کہ کوئی آدمی اس دنیا میں کب تک زندہ رہے گا، اللہ کا کام ہے۔ اس سے زندگی سلب کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ وہ ایسا کرتا ہے تو اللہ کے اقتدار میں دخل دیتا ہے، اُسے اس کی سزا ملے گی۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ انسان صرف ایک خدا کا بندہ ہے اور اسے بندہ ہی بن کر رہنا ہوگا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس میں اس بات کا اعلان ہے کہ انسان پر حکومت صرف اللہ کی ہونی چاہیے۔ کسی دوسرے کو اسے غلام بنانے کا حق نہیں ہے۔ اور ہر اقتدار کو اللہ کے اقتدار کے تابع ہونا چاہیے۔ اس سے آزاد ہوکر کسی انسان پر دوسرے انسان کا مذہبی اقتدار جائز ہے اور نہ سیاسی اقتدار۔ اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ انسان محترم ہے۔ اس احترام کے بہت سے پہلو ہیں۔ اسے اس کے فطری حقوق سے محروم کرنا اس احترام کے منافی ہے۔ اگر انسان کو ذلیل کیا گیا تو وہ محترم نہیں رہا، ذلیل ہوا۔ قرآن مجید اس کے خلاف ہے۔ اسی طرح اسلام کے نزدیک قانون دینے کا حق صرف اللہ کو ہے اور انسان اس قانون کا پابند ہے۔ ہاں اس کے عطا کردہ قانون کی روشنی میں وہ حالات کے لحاظ سے اجتہاد کرسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کسی فرد یا جماعت کو مطلق فرماں روائی کا حق حاصل نہیں ہے۔ اللہ کے قانون کے حاکم اور محکوم دونوں ہی پابند ہوں گے۔ یہ اس کے بعض بنیادی تصورات ہیں۔ دنیا کے ہر دستور میں تمہیدی باتیں یا رہنما اصول ہوتے ہیں۔ اسلام کے اساسی تصورات کو راہ نما اصول کہا جاسکتا ہے۔ ان سے انسانی حقوق کا متعین تصور ابھرتا ہے اور ایک خاص رُخ اختیار کرتا ہے۔

اسلام نے صرف قانون ہی نہیں دیا ہے بلکہ وہ آگاہ کرتا ہے کہ اگر اس قانون پر عمل نہ ہوتو اللہ کے یہاں اس کی گرفت ہوگی۔ وہ آخرت کا خوف پیدا کرتا ہے، جس کی وجہ سے قانون کے احترام اور اس کی پابندی کا جذبہ آدمی کے اندرون سے ابھرتا ہے۔ آخرت پر یقین ہوتو انسان اللہ کے قانون کی خلاف ورزی آسانی سے نہیں کرسکتا۔

حقِ حیات

انسان کے حقوق شخصی، ذاتی، سماجی، معاشی، سیاسی کئی طرح کے ہیں جو اسے لازماً ملنے چاہئیں۔ ان میں اس کا اولین اور بنیادی حق یہ ہے کہ اسے زندہ رہنے دیا جائے۔ قرآن مجید کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہے کہ اس نے اس حق کو کتنی اہمیت دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسان جو خدا کی اس زمین پر پیدا ہوتا ہے اسے زندہ رہنے کا حق ہے۔ بعض لوگ اس کے اس حق کو پامال کر رہے تھے، اس نے ان کے خلاف آواز بلند کی۔ جو لوگ معاشی، سماجی، مذہبی یا کسی بھی وجہ سے انسان کی جان کا احترام نہیں کر رہے تھے قرآن نے ان کو چیلنج کیا۔ اس نے کہا کہ کسی کو کسی کی زندگی چھیننے کا حق ہی حاصل نہیں ہے۔ قانون کے ماہرین کہتے ہیں کہ کوئی حق مطلق (Absolute) نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ شرائط ہوتے ہیں اور اس میں استثنا بھی ہوتا ہے۔ قرآن نے صاف الفاظ میں اس کی وضاحت کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی جان بے شک محترم ہے، لیکن حق و انصاف کا احترام اس سے زیادہ ضروری ہے۔ لہٰذا حق و انصاف کا تقاضا ہوتو انسان کی جان لی بھی جاسکتی ہے۔ بعض جرائم وہ ہیں، جن کے ارتکاب کے بعد وہ اپنا حق حیات کھودیتا ہے۔ وہ اللہ کے نیک بندوں کا ایک وصف یہ بیان کرتا ہے۔

وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ
وہ انسانی جان کو جسے اس نے محترم قرار دیا ہے قتل نہیں کرتے مگر حق کے ساتھ۔ (الفرقان:٦٨)

مطلب یہ کہ حق و انصاف کا تقاضا ہوتو اللہ کے نیک بندے انسان سے اس کا حقِ حیات چھین لیتے ہیں۔ لیکن اگر حق و انصاف اجازت نہ دے تو کسی بھی شخص کو خواہ وہ وقت کا بادشاہ اور مملکت کا فرماں روا ہی کیوں نہ ہو، یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ کسی کو اس کے زندہ رہنے کے حق سے محروم کردے۔

حقِ مساوات

انسانی حقوق پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں مساوات کو تمام اجتماعی حقوق کی اساس قرار دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی تصور سے تمام حقوق نکلتے ہیں کہ سارے انسان مساوی حیثیت کے مالک ہیں۔ ان میں عورت، مرد، بڑے، چھوٹے، امیر، غریب، مالک اور مزدور سب کا درجہ ایک ہے۔ ان میں رنگ و نسل، وطن، علاقے، جنس اور صنف کی بنا پر کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام نے مساوات کی یہ آواز جتنے زوردار طریقے سے اٹھائی، اس سے زور دار آواز اٹھائی نہیں جاسکتی۔ قرآن کی آیات اس سلسلے میں معروف ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقعے پر رسول اللہ نے جو بے نظیر خطبہ دیا، جسے انسانی حقوق کا اولین منشور کہیں تو بے جا نہ ہوگا، اس میں آپ نے فرمایا:

لا فضل لعربی علٰی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقویٰ[1]	نہ تو عربی کو عجمی پر اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے الاّ یہ کہ (کسی میں) تقویٰ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں سب سے پہلے عرب کا ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ عربوں کے ذریعے اسلامی انقلاب آیا تھا۔ عرب اس وقت تختِ حکومت پر فائز اور فرماں روا تھے۔ ان سے کہا گیا کہ یاد رکھو کسی عربی کو کسی عجمی پر فوقیت نہیں ہے اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ 'الا بالتقویٰ' کا مطلب یہ ہے کہ برتری تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر کسی کے اندر تقویٰ ہے تو وہ افضل ہے۔ اس کا احترام ضرور ہونا چاہیے اور سوسائٹی میں اس کی عزت و توقیر ہونی چاہیے۔ اس کی جگہ یہ دیکھنا کہ کون گورا ہے، کون کالا، کون عربی ہے اور کون عجمی، کس کا کس ملک سے تعلق ہے اور کون مرد ہے اور کون عورت ہے، ناجائز اور غیر اسلامی رویہ ہے۔ یہ اعلان اس وقت ہوا جب دنیا میں مساوات کا واضح تصور تک نہیں پایا جاتا تھا۔

---

[1] مسند احمد: ۵/۴۱۱

حقِ انصاف

انسان کا ایک بنیادی حق یہ مانا جاتا ہے کہ اسے عدل و انصاف حاصل ہو۔ اس معاملے میں اسلام کا موقف بہت واضح ہے۔ وہ پوری امت مسلمہ کو عدل و انصاف کی علم بردار کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اسے حکم ہے کہ ہر فرد کے ساتھ بے لاگ انصاف کرے اور دشمن کے ساتھ بھی عدل و انصاف کی روش پر قائم رہے اور کسی بھی معاملے میں ناانصافی کا رویہ نہ اختیار کرے، اس لیے کہ یہ تقویٰ اور خدا ترسی کے سراسر خلاف ہے۔ عدل و انصاف کے خلاف قدم اٹھاتے ہوئے آدمی کو خدا کی پکڑ سے بچنا چاہیے۔ اور اسے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اللہ کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ (ملاحظہ ہو: المائدۃ:۸)

قانون کی برتری

مساوات اور عدل و انصاف کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ معاشرے میں قانون کو برتری حاصل ہو، تاکہ ہر شخص اس اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکے کہ قانون اس کی پشت پر ہے اس لیے اس کے ساتھ کوئی ناانصافی یا اس کی حق تلفی نہ ہوگی۔ یہ بات اس طرح کہی جاتی ہے، جیسے اس سے پہلے دنیا میں اس کا تصور ہی نہیں تھا۔ اسلام نے یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ کہی ہے کہ قانون کے سامنے سب برابر ہیں۔ اس کے مقابلے میں کسی کو دم مارنے کی اجازت نہ ہوگی۔ مشہور واقعہ ہے جو صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں موجود ہے کہ بنومخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو نبی اکرم ﷺ سے درخواست کی گئی کہ اس عورت نے چوری کی ہے، لیکن شریف گھرانے کی ہے۔ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ کوئی اور سزا دے دی جائے۔ نبی ﷺ کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ آپ نے فرمایا کہ قومیں اسی طرح تباہ ہوئی ہیں کہ ان میں جو بااقتدار اور شریف سمجھے جاتے تھے انھوں نے اگر کوئی غلط کام کیا تو ان کو سزا نہیں دی گئی

اور جو کم زور تھے ان کو سزا دی گئی۔ پھر اس کے بعد وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا جو شاید پیغمبر ہی کی زبان سے نکل سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو آج میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ مطلب یہ کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ یہ بڑے کے لیے بھی ہے چھوٹے کے لیے بھی، مرد کے لیے بھی ہے اور عورت کے لیے بھی۔ اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ اتنا صاف اور واضح تصور ہے کہ قانون کی برتری کا اس سے بہتر اور واضح تصور پیش نہیں کیا جاسکتا۔

جرم عدالت سے ثابت ہوگا

کہا جاتا ہے کہ انصاف کے لیے ضروری ہے کہ جرم عدالت سے ثابت ہو۔ اس کے بغیر سزا نہ دی جائے۔ یہ تصور بھی شاید اسلام ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

واللہ لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر عدول[1]

قسم خدا کی کسی شخص کو قید نہیں کیا جائے گا جب تک کہ عادل لوگ اس کے مجرم ہونے کی گواہی نہ دیں۔

اسلام کے نزدیک ریاست کی ذمے داری ہے کہ وہ دیکھے کہ قانون کہیں مجروح تو نہیں ہو رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الامیر الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیتہ[2]

لوگوں پر جو امیر ہے وہ ان کا نگراں ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔

راعی چرواہے اور نگراں کو کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح ایک چرواہا بکریوں کے ریوڑ کا ذمے دار ہوتا ہے اسی طرح امام بھی اپنی رعیت کا ذمے دار ہے۔ اس

---

۱ موطا امام مالک: کتاب الاقضیہ، باب ماجاء فی الشھادات

۲ بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ اطیعوا اللہ و رسولہ الخ، مسلم: کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل

کی حیثیت کسی مطلق العنان بادشاہ یا جابر و قاہر حاکم کی نہیں بلکہ چرواہے کی ہے، جو یہ دیکھتا رہتا ہے کہ کہیں کسی پر ظلم تو نہیں ہو رہا اور اس کے ساتھ ناانصافی تو نہیں ہو رہی ہے۔ ریاست کا فرض ہے کہ اس بات کی نگرانی کرتی رہے کہ کسی کا حق ضائع نہ ہونے پائے اور اسے کسی پہلو سے نقصان نہ پہنچے۔

معاشی جدوجہد کا حق

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ انسان کو اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کا حق ملنا چاہیے۔ اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں بالکل واضح ہی نہیں، بہت وسیع ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پوری زمین میں انسانوں کی معیشت کا ساز و سامان پھیلا ہوا ہے۔ اس سے سب ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ (الاعراف:۱۰)

ہم نے تمھیں زمین میں اقتدار دیا اور اس میں تمھارے لیے معاش کے سامان رکھ دیے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی اس زمین میں جو اسبابِ معاش ہیں ان سے فائدہ حاصل کرنے کا ہر ایک کو حق ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ (الملک:۱۵)

زمین کے کناروں پر چلو اور اللہ نے اس میں جو رزق رکھا ہے اسے کھاؤ۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ زمین کے ہر گوشے پر تمھیں پہنچنے اور اللہ نے جو رزق رکھا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔ اسلام کے نزدیک حصولِ معاش میں کوئی ناجائز رکاوٹ، قانوناً جرم ہے۔ انسان کو معاشی جدوجہد کی آزادی فراہم کرنے کے ساتھ وہ اس بات کو بھی یقینی بناتا ہے کہ اسے اچھی غذا ملے۔ وہ گندی غذا استعمال کرنے اور گلی سڑی چیزیں کھانے پر مجبور نہ ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کا انسان پر یہ احسان ہے کہ اسے طیبات دی گئی ہیں۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اسے طیب اور پاک صاف

غذا ملنی چاہیے۔ یہ اس کا ایک بنیادی حق ہے۔ اس کے نزدیک لباس بھی انسان کی ایک فطری ضرورت ہے۔ آدم علیہ السلام جب ننگے ہوگئے تو انھوں نے کہا کہ اے اللہ میں ننگا ہوگیا ہوں۔ کچھ نہیں ملا تو درخت کے پتوں ہی سے خود کو چھپانے لگے۔ اسلام کی رو سے انسان کی یہ فطری ضرورت لازماً پوری ہونی چاہیے۔ اسی طرح اسے مکان ملنا چاہیے اور حسب سہولت اس کے پاس خادم بھی ہونا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو ہم سرکاری خدمت پہ لیں گے اگر اس کی شادی نہیں ہوئی ہے تو اس کو یہ حق ہے کہ بیت المال سے شادی کے اخراجات لے، اپنے لیے کپڑے کا انتظام کرے۔ وہ اپنے لیے مکان بھی بنا سکتا ہے اور سواری بھی رکھ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کا حق اس کو نہیں ہوگا۔ علمائے کرام نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ریاست کی معاشی حالت کیا ہے؟ بہر حال اسلامی ریاست یہ ذمے داری لیتی ہے کہ کوئی شخص بھوکا پیاسا نہ رہے اور یہ سوچنے پر مجبور نہ ہوجائے کہ اب میرا کوئی پوچھنے والا نہیں رہا۔ صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ **من ترک مالا فلورثته** یعنی کوئی شخص اس حال میں دنیا سے جا رہا ہے کہ اس نے مال چھوڑا ہے تو یہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔ **و من ترک عیالا فالیَّ انا ولی من لا ولی له** لیکن اگر کوئی بال بچے چھوڑ کر جاتا ہے اور مال چھوڑ کر نہیں جاتا ہے تو اس کا ولی میں ہوں گا اور اس کی نگہ داشت میرے ذمے ہے۔ اس کے سلسلے میں علماء نے لکھا ہے کہ یہ ریاست کی ذمے داری ہے کہ کسی بھی بچے اور کسی بھی فرد کی ضروریات پوری ہونے سے نہ رہ جائیں۔ خاندان میں اس کا کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے تو ریاست اس کی ضروریات پوری کرنے کی ذمے دار ہوگی۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ انسان دنیا کو مقصود نہ بنائے۔

سماجی حقوق

حقوق کے ذیل میں سماجی و معاشرتی حقوق کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ اسے لازماً ملنے چاہئیں۔ سماجی اور معاشرتی حقوق کا تصور یہ ہے کہ آدمی سماج اور معاشرے میں

فعّال کردار (Active Part) ادا کر سکے۔ یہ اس کا حق ہے کہ اسے بے کار یا عضو معطل بنا کے نہ رکھ دیا جائے۔ اس پر ایسی پابندیاں نہ ہوں کہ وہ کچھ نہ کر سکے۔ اسلام میں اس کا تصور بالکل واضح ہے۔ اسلام فکر و عمل کی آزادی کا قائل ہے۔ جو لوگ غور و فکر نہیں کرتے ان کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ انھیں کیا ہوگیا ہے کہ جانوروں کی طرح بے سوچے سمجھے زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ دنیا کے آغاز و انجام پر غور کریں اور سمجھیں۔ عمل کی بھی وہ پوری آزادی دیتا ہے البتہ ہر شخص کو اس بات کی پابندی ضرور کرنی ہوگی کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے، جس سے فساد پھیلے اور معاشرہ کو نقصان پہنچے۔ پیغمبروں کی دعوت کی اولین بنیاد توحید ہوتی تھی، یعنی یہ کہ اللہ واحد کی عبادت کی جائے، پھر وہ کہتے تھے:

لاَ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلاَحِهَا — زمین میں اصلاح کے بعد بگاڑ نہ پیدا کرو۔ (الاعراف:۸۵)

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنے قانون کو اصلاح کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس کی موجودگی میں فساد برپا نہ کرو۔

اظہارِ خیال کی آزادی

اظہار خیال کی آزادی انسان کا ایک بنیادی حق ہے۔ اسلام نے اسے یہ حق عطا کیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے اس حق پر ناروا پابندی نہیں لگنی چاہیے، لیکن وہ اس بات کا اسے پابند بناتا ہے کہ اظہارِ خیال کے نام پر وہ بے حیائی نہ پھیلائے، کسی کی دل آزاری نہ کرے، کسی کا مذاق نہ اُڑائے، کسی کی عزت و آبرو سے نہ کھیلے اور ملک و ریاست کو خطرے میں نہ ڈالے اور اس کے خلاف سازش نہ کرے۔ ان شرائط کے ساتھ اسے اظہار رائے کی آزادی ہے۔ دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو اس پر اس نوعیت کی پابندی نہ لگاتا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ آج بہت ساری چیزوں کا شمار بے حیائی میں نہیں ہے۔ اسے اس کی چھوٹ حاصل ہے۔

خاندانی زندگی گزارنے کا حق

یہ بھی انسان کا ایک حق سمجھا جاتا ہے کہ اسے خاندان بسانے کی اجازت ہو۔ اس لیے کہ خاندان انسان کی ایک فطری ضرورت ہے۔ اس معاملے میں اسلام کی تعلیمات اتنی واضح ہیں کہ اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خاندان خدا کا عطیہ اور انعام ہے۔ آدمی کے بچوں اور پوتوں کا پھیلنا اس کے لیے زحمت نہیں بلکہ باعثِ رحمت ہے۔ خاندان کے سلسلے میں اس سے بڑی بات اور کیا کہی جاسکتی ہے؟ پھر یہ کہ اس نے خاندان کا پورا سسٹم دیا ہے اور اسے باقی رکھنے کی تاکید کی ہے۔

خلوت کا حق

تنہائی اور خلوت (Privacy) کو بھی انسان کا ایک حق تسلیم کیا گیا ہے۔ قرآن نے نہ صرف یہ کہ یہ حق دیا ہے کہ بلکہ اس کی تاکید کی ہے کہ کسی کی نجی زندگی میں مداخلت نہ کی جائے یہاں تک کہ حکومت کو بھی اس میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔

ملکی و ملّی خدمات کا حق

یہ بھی انسان کا ایک بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے اور اسلام میں یہ حق پہلے سے موجود ہے کہ انسان کو ملک و ملت کی خدمت اور تنقید و اصلاح حال کا موقع ملنا چاہیے۔ اسلام نے انسان کو یہ حق فراہم کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو انسان ملک کی خدمت کرتا ہے وہ سماج کا بہترین اور قابل قدر انسان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قوی مومن ضعیف مومن سے بہتر ہے۔“ اس لیے کہ طاقت ور مومن انسانوں کی، سماج اور معاشرے کی خدمت کرے گا۔ جو کم زور ہے اس سے اس کی توقع مشکل ہی سے کی جاتی ہے۔ ایک موقعے پر آپ نے فرمایا کہ ”وہ مومن جو لوگوں سے ملتا جلتا ہے، ان کی تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے وہ بہتر ہے اس مومن سے جو نہ کسی سے ملتا ہے اور نہ ان سے پہنچنے والی تکلیفیں برداشت کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ انسان کا حق ہے کہ وہ

سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے۔ منافقوں سے کہا گیا کہ تمھاری سرگوشیاں تمھارے حق میں سود مند نہیں ہیں، اس لیے کہ یہ ایک طرح کی سازشیں ہیں۔ ہاں اگر تم لوگوں کی اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بات کرو تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہوگا اور اللہ اجر عظیم سے نوازے گا۔ (النساء:۱۱۴)

دفاع کا حق

ایک اور چیز جس کا آج بڑا چرچا ہے وہ ہے دفاع۔ اس بات کو تو دنیا تسلیم کرتی ہے کہ ہر ایک کو دفاع کا حق ہے۔ کوئی شخص کسی کی جان لینا چاہے، کسی کی عزت و آبرو پر حملہ آور ہو یا کسی کا مال چھیننا چاہے، اس کی جائیداد پر قبضہ کرنا چاہے، اس کے گھر کو آگ لگانا اور اس کی بیوی بچوں پر حملہ کرنا چاہے، تو ظاہر ہے کہ وہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔ اس کا دفاع کرے گا، لیکن اس میں بے احتیاطی دو پہلوؤں سے ہوتی ہے۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ دفاع کے نام پر آدمی ان باتوں کا خیال نہیں رکھتا، جن کا خیال رکھنا چاہیے۔ اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ دہشت گردی اور تشدد کے نام پر آدمی کو دفاع کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اسلام میں دفاع کا بہت واضح تصور موجود ہے کہ دفاع کب ہونا چاہیے اور کیسے ہونا چاہیے، وہ کن حالات میں جائز ہے اور کس حد تک جائز ہے اور کہاں حدود سے تجاوز ہوتا ہے؟ یہ تمام چیزیں قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور ہمارے علماء و فقہاء نے بھی بڑی تفصیل سے اس پر لکھا ہے۔ دفاع انسان کا بنیادی حق ہے لیکن اگر دفاع کے نام پر ظلم ہو تو یہ غلط ہے۔ یہاں انفرادی دفاع کی بات ہے۔ ریاست اور ریاست کے درمیان جو مقابلہ ہوتا ہے اس کی یہاں بحث نہیں ہے۔

کم زوروں کے حقوق

کسی جمہوری آئین کی ایک لازمی خصوصیت یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں اقلیتوں اور کم زور طبقات کے لیے تحفظ فراہم کیا جائے، انھیں دوسروں کے مساوی حقوق

دیے جائیں، ان کی حق تلفی نہ ہونے پائے اور انھیں ظلم و زیادتی سے بچانے کی تدبیر کی جائے۔

اسلام کے آنے سے پہلے کم زوروں کے حقوق عرب ہی میں نہیں دنیا میں کہیں بھی محفوظ نہیں تھے۔ ان کا بری طرح استحصال ہورہا تھا اور ان پر ظلم و زیادتی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ اسلام نے شروع ہی سے ان کے حق میں آواز اٹھائی اور ان پر جو ظلم و زیادتی ہو رہی تھی اس پر سخت وعید سنائی اور دنیا و آخرت میں اس کے برے انجام سے خبردار کیا۔ اس نے خواتین کے، زیر دستوں اور محکوموں کے، یتیموں، لاوارث بچوں، معذوروں، بوڑھوں اور ضعیفوں کے حقوق صرف بیان ہی نہیں کیے بلکہ عملاً فراہم کیے اور معاشرہ کو ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کی ترغیب دی اور ہم دردی اور تعاون کا جذبہ پیدا کیا۔

مذہبی آزادی کا حق

حقوق انسانی کے علم بردار مذہبی آزادی کو بھی انسان کا ایک حق قرار دیتے ہیں۔ اسلام نے بہت واضح الفاظ میں اس کا اعلان کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کو اپنے دین کا پابند بنا دیتا کہ کوئی اس سے بغاوت نہ کرتا، لیکن اللہ نے مذہب کے معاملے میں اس کو آزادی دی ہے اور اس کی یہ آزادی باقی رہنی چاہیے۔ اسی میں اس کا امتحان ہے۔ حضور ﷺ کے قلب میں فطری طور پر یہ تمنا موج زن تھی کہ آپ کے مخاطبین میں سے ہر ایک کو راہ ہدایت مل جائے۔ آپ سے کہا گیا:

لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰاهُمۡ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ (البقرۃ:۲۷۲)

آپ کی ذمے داری نہیں ہے کہ لازماً انھیں راہِ راست پر لے آئیں، بلکہ یہ اللہ کا کام ہے وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

یہ اصول بھی بیان ہوا ہے کہ

لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ (البقرۃ:۲۵٦)

دین کے سلسلے میں کوئی جبر نہیں ہے، ہدایت اور ضلالت واضح ہوچکی ہے۔

یعنی اب یہ آدمی کا اختیار ہے کہ وہ جس راہ کو چاہے اختیار کرے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف:۲۹) جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے انکار کردے۔

قرآن مجید نے کہا کہ مذہب پر گفتگو بھی ہوسکتی ہے، لیکن یہ گفتگو تہذیب کے دائرے میں ہونی چاہیے۔ ہدایت ہے: وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ یعنی مذہب پر گفتگو ہو تو سلیقے اور تہذیب سے ہو، اس کے لیے غلط اور ناشائستہ انداز نہ اختیار کیا جائے۔ ہمارے علما نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم، اسلامی ریاست میں علی الاعلان یہ کہتا ہے کہ میں قرآن کو اللہ کی کتاب نہیں مانتا، محمد ﷺ کو اللہ کا رسول نہیں تسلیم کرتا تو بھی اسلامی حکومت اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرے گی۔ ہاں اگر وہ بدزبانی پر اتر آئے تو اس کے خلاف کارروائی کی جائے گی، رسول اللہ ﷺ کی شان میں یا حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ یا کسی بھی پیغمبر کی شان میں گستاخی ایک قابل تعزیر جرم ہے۔ اس کے ارتکاب پر اسلامی ریاست قتل کی سزا تک دے سکتی ہے۔ اسی طرح کسی بھی مذہب کے بانی یا اس کی محترم شخصیات کی توہین و تحقیر اور اس کے متعلق بدکلامی، سزا کی مستحق ہوگی اور قانون کے مطابق اس پر سزا دی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ جو حقوق کسی فرد یا طبقہ کو لازماً ملنے چاہئیں اسلام وہ تمام حقوق فراہم کرتا اور انسان کے فطری تقاضوں کی بہتر انداز میں تکمیل کرتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ دنیا ہی کی کامیابی کا نہیں، آخرت کی فوز و فلاح کا بھی ضامن ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے دونوں جہاں کی کامیابی کے لیے کسی دستور اور کسی ضابطہ حیات کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔[1]

---

[1] اس موضوع کی تفصیل راقم کی کتاب 'اسلام- انسانی حقوق کا پاسبان' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر ابو الفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

کم زور کے مسائل اور اسلام

کیا مذہب کم زور کا دشمن ہے

پروپیگنڈہ میں بڑی تاثیر ہے۔ اس سے ایسی فضا بن جاتی ہے کہ اس کے خلاف سوچنا مشکل ہوتا ہے، بولنا تو اور بھی مشکل ہے۔ لیکن پروپیگنڈہ سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ کسی غلط بات کو صبح و شام دہرایا جائے تو بعض اوقات اچھے خاصے معقول اور سمجھ دار لوگ بھی دھوکا کھا جاتے ہیں اور اس کی صحت پر یقین کر بیٹھتے ہیں، لیکن اس سے کوئی غلط بات صحیح نہیں قرار پاتی۔ غلط، غلط ہی ہے، چاہے اس کے حق میں پوری دنیا چیخنے چلانے ہی کیوں نہ لگ جائے۔ صحیح اپنی جگہ صحیح ہے، چاہے اس کی تائید میں ایک آواز بھی نہ اٹھے۔ مذہب کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ پہلے بھی بڑے زور شور سے ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہوتا رہتا ہے کہ وہ سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے۔ طاقت ور کا دوست اور حلیف ہے، کم زور کے استحصال اور اس کو غلام بنائے رکھنے کا ذریعہ ہے۔ مذہب افیون کی گولی یا مارفیا کا انجکشن ہے جو کم زور کو اس لیے لگایا جاتا ہے کہ اس کے جسم کا رہا سہا خون بھی اس طرح چوس لیا جائے کہ اس کو اس کا احساس تک نہ ہو۔ اور جو شخص پہلے ہی سے خوب تنو مند اور طاقت ور ہے وہ اب کچھ اور موٹا تازہ اور فربہ ہوکر مزید خون آشامی کرتا پھرے۔

دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں۔ اسلام کو بھی ان ہی مذاہب میں سے ایک مذہب سمجھا جاتا ہے۔ یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر ایک بات عرض کردینی مناسب ہوگی۔ وہ یہ کہ اسلام عام معنی میں مذہب نہیں ہے، بلکہ وہ ایک دین ہے، جو پوری زندگی پر خدا کی حکومت اور فرماں روائی چاہتا ہے۔ بہرحال قصد و ارادے یا غلط فہمی سے مذہب پر اعتراض کیا جاتا ہے تو اسلام بھی بڑی آسانی سے اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ یہاں ماضی سے بحث نہیں، کم از کم اس وقت اصل ہدف اسلام ہی ہے۔ اگر ضمناً دوسرے مذاہب بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں تو اس میں پروپیگنڈہ کرنے والوں کا کوئی نقصان نہیں، بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اسلام کو خاص طور سے نشانہ بنانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مذاہب عالم میں اسلام ہی سب سے زیادہ جان دار اور طاقت ور مذہب ہے۔ اپنے ماننے والوں پر اس کی گرفت جتنی مضبوط ہے اتنی کسی دوسرے مذہب کی نہیں ہے۔ اسلام کو بہ طور خاص ہدف بنانے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس کے اندر ایک نئے انقلاب کی جتنی طاقت اور صلاحیت ہے وہ کسی دوسرے مذہب یا فلسفے میں نہیں ہے، اس لیے اسلام کی نظریاتی شکست کے بعد کسی دوسرے مذہب یا فلسفہ سے موجودہ حالات میں یہ خطرہ نہیں ہے کہ وہ حریف بن کر سامنے آئے گا۔

مذاہبِ عالم کے بارے میں لکھنے والے کی معلومات بہت محدود ہیں، اس لیے اسے ان کی ترجمانی یا دفاع کا حق نہیں ہے۔ البتہ اسلام کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے وہ یہ عرض کرنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ مذکورہ بالا پروپیگنڈہ ایک الزام ہے۔ الزام تراشی کے لیے بھی کوئی نہ کوئی بنیاد تلاش کرلی جاتی اور رائی کا پہاڑ بنالیا جاتا ہے۔ لیکن ڈھونڈے سے بھی اس کی کوئی بنیاد اسلام میں نہیں ملتی۔ بے بنیاد الزام کا اسے شاہ کار کہا جاسکتا ہے۔

کم زور کی وکالت

اسلام کو اگر کم زوروں کا نمائندہ یا وکیل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ وکیل کا لفظ

کچھ بدنام سا ہوگیا ہے۔ وکیل، موکل کی وکالت کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اسے اس سے بحث نہیں ہوتی کہ وہ صحیح بات کی وکالت کر رہا ہے یا غلط بات کی۔ بلکہ شاید کامیاب وکیل وہی سمجھا جاتا ہے جو جھوٹ کو سچ اور ظالم کو مظلوم ثابت کردے اور غلط سے غلط مقدمہ کی بھی اس طرح پیروی کرے کہ حق والا آہ و فغاں کرتے ہوئے اور حق کا جھوٹا دعوے دار مسرت اور خوشی کے شادیانے بجاتے ہوئے لوٹے۔ اسلام نے کم زور کی وکالت کی تو کسی غلط مقدمہ کی نہیں بلکہ ایک صحیح اور جائز کیس کی وکالت کی اور اس طرح کی کہ آج تک اس کے حق میں جو کچھ کہا جاتا ہے یا آئندہ کہا جاسکتا ہے سب اسی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے۔

کم زور کے حقوق کی حفاظت

اسلام کم زور کا وکیل ہی نہیں اس کے حقوق کا محافظ اور نگہبان بھی ہے۔ کم زور کا دنیا میں کوئی حق نہیں تھا۔ وہ دوسروں کے رحم و کرم پر جیتا تھا۔ جیتا کیا تھا یہ سوچ کر زندگی کے دن کاٹتا رہتا تھا کہ موت کے بعد چین کی نیند سو جائے گا۔ اس کے جسم و جان دونوں عذاب میں مبتلا تھے۔ اس پر جو بھی ظلم کیا جاتا دنیا کی کسی عدالت میں اس کی شنوائی نہیں تھی۔ اس کا وجود سب کی خدمت اور راحت کے لیے تھا، لیکن خود اس کی راحت کا یہاں کوئی سامان نہ تھا۔ سماج میں اس کی حیثیت اس قدر گرگئی تھی کہ وہ اپنے وجود ہی پر شرم بلکہ نفرت اور گھن محسوس کرتا۔ یہ اس کا ماضی تھا۔ اس کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ہاں کم زور اور اس کے مسائل کا چرچا اس قدر بڑھ گیا ہے کہ خیال ہونے لگتا ہے کہ اب اس کے برے دن پھر جائیں گے اور اس کے دکھ درد کا مداوا ہوگا اور وہ ایک نئی اور تابناک زندگی کا آغاز کرے گا۔ لیکن یہ بھی ایک خواب ہے۔ کم زور کے ساتھ ہم دردی کا اظہار کرنا، اس کی حمایت کا دم بھرنا، اس کے حقوق کے لیے نعرے لگانا، اس کی تائید میں خطبات اور مقالات پڑھنا، لکچرس دینا اور وعظ کرنا آسان ہے۔ اس کے لیے کسی محنت، قربانی بلکہ سنجیدہ فیصلہ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔

یہی وجہ ہے کہ خود غرض اور مفاد پرست انسان بھی اس کا سہرا اپنے سر بندھوانا چاہتا ہے، بلکہ اس خدمت بابرکت کو کم زور کے دشمن بھی اس شان سے اور اتنے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ انجام دیتے ہیں کہ بے چارہ کم زور اپنی سادہ لوحی میں ان کو اپنا بہی خواہ اور ہم درد سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے کم زور کے مسائل نہ حل ہوئے ہیں اور نہ حل ہوں گے۔ وہ معاشی، سیاسی، سماجی، معاشرتی اور علمی و اخلاقی لحاظ سے جہاں کلٗ تھا آج بھی وہیں ہے اور آئندہ بھی وہیں رہے گا۔ اور اس کا استحصال کرنے اور لوٹنے والے بھیس بدل بدل کر نت نئے ناموں سے اور جدید سے جدید تر ہتھیاروں سے لیس ہو کر اسے لوٹتے اور استحصال کرتے رہیں گے۔

اسلام نے کم زور کو اس کے سلب کردہ حقوق دیے، اس پر ہونے والے ظلم و زیادتی کا خاتمہ کیا۔ اس کے اندر جرأت و ہمت اور استقلال پیدا کیا، اور اسے باعزت اور باوقار زندگی عطا کی۔ اسلام اس کے لیے ایک ابر رحمت تھا۔ اس سے اس کے تن مردہ میں جان آئی اور اس کی سوکھی کھیتی لہلہا اٹھی۔ اسے وہ سکون اور راحت ملی، جس کا تصور بھی وہ آسانی سے نہیں کر پا رہا تھا۔

مسائل کا وسیع تصوّر

کم زور اور اس کے مسائل سے ہر طرف بحث جاری ہے اور انھیں حل کرنے کی تدبیریں اور کوششیں بھی برابر ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ ساری کوششیں اس کے ایک معاشی مسئلہ کے گرد گھومتی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ کم زور کا اصل مسئلہ معاشی مسئلہ ہے، یہ اگر حل ہو جائے تو اس کے تمام مسائل از خود حل ہو جائیں گے۔ لیکن یہ کم زور کے مسائل کا، بلکہ کسی بھی انسان کے مسائل کا بہت محدود تصور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معاشی مسئلہ کی بڑی اہمیت ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان نرا معاشی حیوان نہیں ہے کہ چارہ پانی پاکر آسودہ و مطمئن ہو جائے اور اس کی کمیت و کیفیت جتنی بہتر ہو اتنی ہی اس کی آسودگی بڑھتی چلی جائے۔ غذا، لباس، مکان، تعلیم، دوا علاج انسان کی اہم

ضروریات ہیں۔ ان کا پورا ہونا ضروری ہے۔ ان سے بے توجہی نہیں برتی جاسکتی۔ لیکن یہ خیال غلط ہے کہ یہی اس کے کل مسائل ہیں۔ یہ اگر حل ہوجائیں تو وہ ہر پہلو سے بالکل مستغنی اور بے نیاز ہوجائے گا اور کسی طرح کی مدد کی اسے حاجت نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ کم زور کی کم زوری ایک طرح کی نہیں ہوتی۔ وہ معاشی اور سیاسی، سماجی اور معاشرتی، علمی اور فکری، جسمانی اور مادی، اخلاقی اور روحانی کئی طرح کی ہوتی اور ہوسکتی ہے۔ جو شخص بھوکا، ننگا اور مالی مدد کامحتاج ہے یقیناً اس کا مسئلہ معاشی ہے۔ لیکن جو شخص مال و دولت رکھتے ہوئے بھی کسی ناقابلِ علاج بیماری میں گرفتار ہو اس کا مسئلہ معاشی نہیں نفسیاتی ہے۔ وہ روپیہ پیسہ نہیں روحانی سکون چاہتا ہے۔ دولت دنیا سے مالا مال ہونے کے باوجود جس عورت کا اپنی بھر پور جوانی میں اچانک سہاگ لٹ جائے وہ معاشرہ میں تحفظ، عزت اور وقار چاہتی ہے۔ اسی طرح جس شخص کو دولت نے عیاشی اور آوارگی میں مبتلا کردیا ہو اس کی کم زوری معاشی نہیں اخلاقی ہے۔ اسے کھانے کپڑے کی نہیں اصلاح وتربیت کی ضرورت ہے۔ اسلام کی نظر انسان کی ہرطرح کی کم زوریوں پر ہے اور وہ ان سب کا علاج کرتا ہے۔ وہ مسکینوں اور محتاجوں کی معاشی ضرورت پوری کرتا ہے، مزدوروں اور محکوموں کے مسائل حل کرتا ہے، بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرتا اور قرض داروں کی مدد کرتا ہے، عورتوں، بیواؤں اور یتیموں کی سرپرستی کرتا اور سماج میں انھیں اونچا مقام عطا کرتا ہے، بیماروں، معذوروں، ضعیفوں، مصیبت زدوں اور آفت کے مارے ہوؤں کے ساتھ ہم دردی کا رویہ اختیار کرتا اور ان کے دکھوں کا مداوا کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جس شخص کو جس طرح کی وقتی اور ہنگامی یا مستقل اور ہمہ وقتی، چھوٹی یا بڑی، مادی یا اخلاقی مدد کی ضرورت ہو وہ فراہم کی جائے، تاکہ کوئی بھی فرد کسی بھی مرحلہ میں خود کو بے یارو مددگار نہ محسوس کرے اور معاشرہ میں اپنا بھرپور کردار ادا کرسکے۔

کم زور افراد اور طبقات دونوں کی مدد

آج پوری دنیا کم زور اور طاقت ورقوموں میں بٹ گئی ہے۔ جن قوموں کے پاس طاقت اور اقتدار ہے وہ کم زور قوموں کا بری طرح استحصال کررہی ہیں۔ پھر یہ کہ

ہر قوم اور ملک میں کم زور اور طاقت ور دونوں ہی طبقات موجود ہیں۔ ان میں کے طاقت ور طبقات کم زور طبقات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور انھیں ان کے بنیادی انسانی حقوق تک سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ دونوں طبقات ایک دوسرے کے حریف بن چکے ہیں اور ان کے درمیان ملکی، قومی، عالمی اور بین الاقوامی سطح پر شدید کش مکش برپا ہے۔ ان کے مسائل بھی اب طبقاتی اور گروہی مسائل بن چکے ہیں۔ اسی حیثیت سے ان کے بارے میں سوچا بھی جاتا ہے۔ اس طرح مسئلہ کم زور افراد کا نہیں کم زور جماعتوں کا بن گیا ہے۔ لیکن اس طرح سوچتے وقت دو اہم حقیقتوں کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جن طبقات کو ہم آسودہ حال و مطمئن سمجھتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان میں بھی ایسے افراد ہوں جو ہماری ہم دردی کے محتاج ہوں۔ اسی طرح جن طبقات کو ہم کم زور کہتے ہیں ان میں بھی خوش حال افراد ہوسکتے ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسے افراد یقیناً ہوتے ہیں۔ اگر ہم طبقات کی اصطلاح میں سوچیں اور عمل کریں تو بسا اوقات کم زور افراد کی طرف ہماری توجہ نہیں ہوتی اور وہ اس تعاون سے محروم رہتے ہیں جس کے وہ مستحق ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے سامنے انسان کی صرف معاشی کم زوری ہی نہ ہو بلکہ کم زوری کا وسیع تصور ہو تو محسوس ہوگا کہ دنیا کا ہر آدمی دوسرے کی مدد کا محتاج ہے۔ چاہے کسی بھی طبقہ سے اس کا تعلق کیوں نہ ہو۔ مرض، رنج وغم، معذوری، ضعف، بڑھاپا اور جانی ومالی صدمات سے کون نہیں دو چار ہوتا اور ان سب صورتوں میں کون اخلاقی یا قانونی مدد کا محتاج نہیں ہوتا؟

اسلام کسی بھی قوم کے استحصال کو جائز نہیں سمجھتا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ کم زور کو کم زور کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور اسے جس وقت جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو وہ فراہم کرتا ہے۔[1]

---

[1] یتیموں، مسکینوں، غلاموں، محکوموں، ضعیفوں اور معذوروں سے متعلق اسلامی تعلیمات کے لیے ملاحظہ ہو۔ راقم کی کتابیں 'اسلام انسانی حقوق کا پاسباں' اور 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور'۔

کم زور- اسلام کی نظر میں

دنیا میں بادشاہوں، امیروں اور رئیسوں کی حکومت رہی ہے۔ ان ہی کو قیادت و راہ نمائی کا منصب حاصل تھا اور یہ ان کا فطری حق سمجھا جاتا تھا۔ معاشرے کے کم زور افراد اور طبقات کو چار و ناچار ان کے پیچھے چلنا پڑتا تھا۔ ان کے خلاف دم مارنے تک کی انھیں اجازت نہ تھی۔ کسی کا اپنی اور دوسروں کی بھلائی کے بارے میں سوچنا اور اقدام کرنا بغاوت شمار ہوتا اور پوری سختی سے اسے کچل دیا جاتا۔ اسلام نے اس ذہنیت ہی کو غلط ٹھہرایا کہ قیادت کا تعلق دولت وثروت یا اقتدار سے ہے۔ حقیقی قیادت اللہ تعالیٰ کے پیغمبر دنیا کو فراہم کرتے ہیں۔ معاشرے کے کم زور افراد اور طبقات نے اس میں اپنے مسائل کا حل دیکھا اور پورے خلوص سے اس کا ساتھ دیا۔

پیغمبر خوش حال اور حکم راں طبقے سے نہیں ہوتے

دنیا میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے پیغمبر آئے، ہر دور اور ہر زمانہ میں آئے۔ ان کا کردار بے داغ اور ان کی سیرت آئینہ کی طرح صاف اور شفاف تھی۔ ان کے اخلاق پر کسی نے کوئی داغ دھبہ نہیں دیکھا، ان کے جانی دشمنوں نے بھی ان کی رفعتِ اخلاق کا اعتراف کیا۔ ان کا تعلق شریف اور باعزت قبائل سے تو تھا اور وہ خود بھی پورے سماج میں محترم اور معزز سمجھے جاتے تھے، لیکن معاشی اور اقتصادی پہلو سے ان کی کوئی امتیازی حیثیت نہیں تھی۔ ان کا تعلق آسودہ حال اور عیش پسند گروہ سے نہ تھا۔ وہ متوسط یا غریب

طبقہ سے بھیجے جاتے تھے اور ان کی زندگی عیش و عشرت سے پاک ہوتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے دین کے طرف دعوت دی تو عرب کے سرداروں نے کہا:

لَوْلَا اُنْزِلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (الزخرف:۳۱)

یہ قرآن دونوں بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟

حضرت موسیٰؑ کو دیکھ کر فرعون نے کہا:

فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ ۝ (الزخرف:۵۳)

(اگر یہ خدا کا رسول ہے تو) اسے سونے کے کنگن کیوں نہیں پہنائے گئے یا اس کی اردلی میں فرشتوں کا دستہ کیوں نہیں آیا؟

اس خالص مادی اور دنیا پرستانہ ذہن کی قرآن مجید نے جگہ جگہ تردید کی ہے۔[1]

پیغمبروں کا خطاب عام ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ کے جتنے پیغمبر اس دنیا میں آئے سب نے قرآن مجید کی رو سے اسلام ہی کی دعوت دی۔ یہ دعوت بالکل عام ہوتی۔ وہ جس قوم میں آتے اس کے ہر فرد اور ہر طبقہ سے ان کا خطاب ہوتا۔ خوش حال افراد سے بھی، بدحال لوگوں سے بھی، حکم رانوں سے بھی، زیردستوں اور محکوموں سے بھی۔ ان کی دعوت ہر طرح کی طبقاتی

---

[1] اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو دنیا میں حکومت اور اقتدار بھی عطا کیا ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کی وفات کے وقت پورے حجاز پر اللہ تعالیٰ کا دین غالب تھا اور آپ اس کے سربراہ تھے۔ آپ کے بعد آپ کے خلفاء اور جانشینوں کے ذریعے معلوم دنیا کے ایک بڑے حصے پر اسلام کو غلبہ حاصل ہوا۔ یہ سب کچھ دین کی سربلندی کی کوشش کا ثمرہ تھا۔ کسی بادشاہ وقت اور حکم رانِ مملکت کی بعثت رسولؐ کی حیثیت سے نہیں ہوئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے نبی ہوئے اور انھیں خلافت ارضی بھی عطا ہوئی۔ ان کی اولاد میں حضرت سلیمان علیہ السلام ان کے جانشین ہوئے۔ یہ نبوت اور حکومت کا ایک طرح سے تسلسل تھا۔ نبوت کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد خلفائے راشدین کو علوم نبوت اور کارِ سیاست میں اللہ کے آخری رسولؐ کی جانشینی حاصل ہوئی۔

کش مکش سے پاک ہوتی۔ وہ کسی کے ساتھ نہ تعصب برتتے اور نہ بے جا حمایت کرتے۔ وہ سب کی ہدایت کے طالب ہوتے اور سب کو راہ راست پر دیکھنا چاہتے تھے۔

کم زور طبقات پیغمبروں کا ساتھ دیتے ہیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے ہر دور میں جن افراد کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ معاشرہ کے کم زور افراد تھے اور جن طبقات نے ان کی آواز پر لبیک کہا وہ بھی معاشرہ کے کم زور طبقات تھے۔ جو لوگ عیش و عشرت کے دل دادہ اور آسائش و راحت کے مارے ہوئے تھے اور جن کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار اور حکومت کی باگ ڈور تھی، انھوں نے بالعموم اس کی طرف رخ نہیں کیا، بلکہ اس کی شدید مزاحمت اور بدترین مخالفت کی۔ اس سے وہ سعید روحیں مستثنیٰ ہیں جن سے دنیا کا کوئی بھی طبقہ خالی نہیں ہوتا۔ بلاشبہ انھوں نے ہر طرح کی زنجیریں توڑ دیں اور سب کچھ قربان کر کے اسلام کا ساتھ دیا۔ یہاں ایک عمومی رویہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ قرآن میں ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۝
(سبا: ۳۴، ۳۵)

ہم نے جس بستی میں بھی اپنا کوئی ڈرانے والا بھیجا تو اس کے آسودہ حال لوگوں نے کہا کہ جو پیغام تم لائے ہو ہم اسے ماننے والے نہیں ہیں ہم تم سے زیادہ مال، اولاد رکھتے ہیں اور ہمیں ہرگز سزا نہیں دی جائے گی۔

اربابِ اقتدار کے اس رویہ کے مختلف اسباب ہیں۔ ایک تو ان کا یہ غرور کہ دنیا کی ساری سوجھ بوجھ ان ہی کو حاصل ہے۔ وہ خود کو عقلِ کل اور دوسروں کو بے وقوف اور نادان سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اپنی دانائی اور فہم و بصیرت اور دوسروں کی نادانی اور جہالت، بحث سے بلند اور بالکل مسلّم ہوتی ہے۔ وہ دولت و ثروت ہی کو نہیں حق و صداقت کو بھی اپنے گھر کی باندی سمجھتے ہیں۔ وہ یہ تصور نہیں کر سکتے کہ جس فہم و دانش کے سہارے انھوں نے دولت و اقتدار پر قبضہ کیا ہے وہ تو حق و صداقت کو پہچاننے سے قاصر

رہ جائے اور جن نادانوں کو وہ شب و روز لوٹتے رہتے ہیں اور جو ان کے زیردست اور ماتحت ہیں وہ اسے پہچان بھی لیں اور اس کے علم بردار بھی بن جائیں۔ حضرت نوحؑ کا شمار خدا کے جلیل القدر پیغمبروں میں ہوتا ہے۔ ان کا ساتھ جن نیک دل اور مظلوم انسانوں نے دیا، ان کے بارے میں ان کی قوم کے سردار کہتے ہیں۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ ۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ۝

(ہود:۲۷)

اس کی قوم کے سردار جنھوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کردیا تھا بولے کہ ہم تو تمھیں اپنے ہی جیسا ایک آدمی سمجھتے ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذِل تھے، بے سوچ سمجھے تمھاری پیروی اختیار کرلی ہے اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو۔ ہم تو تمھیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔

وہ چاہتے تھے کہ حضرت نوحؑ ان ناسمجھوں اور نادانوں کو اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ اس حماقت اور بے عقلی کے جواب میں حضرت نوحؑ نے فرمایا۔

وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ۝ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۝ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝

(ہود:۲۹-۳۱)

میں ان لوگوں کو دھکے دے کر بھگا نہیں سکتا جو ایمان لائے ہیں، وہ اپنے رب کے حضور میں جانے والے ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ اے میری قوم! اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچائے گا۔ کیا تم لوگوں کو سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی؟ اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں۔ نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں اور یہ بھی میں نہیں کہتا کہ جن لوگوں کو تمھاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں انھیں اللہ کسی بھلائی سے نہیں نوازے گا۔ اللہ ان کے نفس کا حال خوب جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو میرا شمار ظالموں میں ہوگا۔

کم زوروں نے آخری پیغمبر (ﷺ) کا بھی ساتھ دیا

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے ابتدائی دور میں آپ کا ساتھ زیادہ تر کم زوروں ہی نے دیا۔ اس کا اظہار ایک موقعہ پر حضرت ابوسفیانؓ نے شاہِ روم ہرقل سے کیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ حضرت ابوسفیانؓ نے ابھی اسلام نہیں قبول کیا تھا۔ ہرقل نے ان سے پوچھا:

فاشرف الناس یتبعونه ام ضعفاؤهم؟

قوم کے شرفاء محمد ﷺ کی پیروی کر رہے ہیں یا اس کے ضعفاء اور کم زور؟

حضرت ابوسفیانؓ نے جواب دیا۔

بل ضعفاؤهم

قوم کے کم زور لوگ ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔

ہمارے ایک قدیم مورخ ابن اسحٰق نے زیادہ واضح الفاظ میں ابوسفیانؓ کا بیان نقل کیا ہے۔

تبعه منا الضعفاء والمساكين فامّا ذُو الانساب والشرف فما تبعه منهم احد[1]

ہم میں جو ضعیف اور مسکین ہیں وہ ان کا ساتھ دے رہے ہیں، باقی رہے حسب نسب اور عزت وشرف والے تو ان میں سے کسی نے ان کا ساتھ نہیں دیا ہے۔

یہ سن کر ہرقل نے جواب دیا۔

و هم اتباع الرسل[2]

رسولوں کی اتباع کرنے والے یہی (کم زور افراد) ہوتے ہیں۔

علامہ ابن کثیر جن کا مفسر اور مورخ دونوں حیثیتوں سے بڑا اونچا مقام ہے، فرماتے ہیں۔

---

[1] فتح الباری: ۲۶/۱۔

[2] بخاری، کتاب الوحی

كان غالب من اتبعه فی اول بعثته ضعفاء الناس من الرجال والنساء والاماء فلم يتبعه من الاشراف الا قليل[۱]	بعثت کے شروع میں جن لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا ان میں سے زیادہ تر کم زور مرد، عورتیں، (غلام) اور لونڈیاں تھیں۔ اونچے لوگوں میں سے آپ پر ایمان لانے والے بہت تھوڑے تھے۔

قریش کے سرداروں اور سرمایہ داروں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین صحیح اور سچا ہے تو یہ ان بے چارے ضعفاء اور مساکین کے حصہ میں کیسے چلا جائے گا اور ہم اس سے کس طرح بے بہرہ رہ جائیں گے؟ وہ سمجھتے تھے کہ دین اور دنیا کی بھلائی تو ہماری قسمت میں لکھی گئی ہے اور حکمت و دانائی ہمارے باپ دادا کی میراث ہے، اس لیے اگر اس دعوت میں خیر ہوتا تو ناممکن تھا کہ ہم پیچھے رہ جاتے اور معاشرہ کے بدقسمت افراد آگے بڑھ کر اسے قبول کر لیتے۔ قرآن کے الفاظ میں:

لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ؕ (الاحقاف:۱۱)	اگر اس میں خیر ہوتا تو اس معاملہ میں یہ (پس افتادہ) لوگ ہم سے سبقت نہ لے جاتے۔

کبھی کہتے اگر خیر ان کے ساتھ ہے تو یہ فقر و فاقہ اور مصیبت میں کیوں گرفتار ہیں؟ کیوں ان کی حالت بہتر نہیں ہوتی؟ کیا ہماری موجودہ حیثیت اس بات کی شہادت نہیں دیتی کہ عقل و دانش ہمارے ساتھ ہے۔ ہم برسرِ حق ہیں اور ان بے چاروں نے نادانی اور بے وقوفی کی راہ اختیار کر رکھی ہے۔ قرآن مجید نے اس ذہن و مزاج کی ترجمانی

۱؎ تفسیر ابن کثیر: ۱۵۳/۲۔ مکہ میں غلاموں اور زیردستوں کے ساتھ متعدد قبائلِ قریش سے تعلق رکھنے والے جاں بازوں نے بھی شروع ہی سے اسلام کو سینہ سے لگایا اور اس راہ میں قربانیاں دیں۔ ان میں حضرت ابو بکر، حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت سعید بن زید، حضرت جعفر بن ابی طالب، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت ارقم بن ابوارقم رضی اللہ عنہم جیسے اصحاب شامل ہیں۔ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے باہمت اور طاقت ور افراد اسلام کے آغوش میں آگئے۔ پھر یہ کیوں کہا گیا کہ شروع میں سماج کے کم زور افراد نے اسلام کا ساتھ دیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض اصحاب سماج میں نمایاں تھے اور ان کی وجہ سے اسلام کو تقویت بھی پہنچی، لیکن بیش تر کم سن تھے۔ ان کی حیثیت سردارانِ قبائل کی نہیں تھی، بلکہ وہ اپنے قبائل کے زیر اثر تھے اور ان کی زیادتیاں برداشت کر رہے تھے۔

ان الفاظ میں کی ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِیًّا○ (مریم:۷۳)

جب ان کو ہماری بالکل واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ دونوں فریقوں میں سے کون مال و منال کے لحاظ سے بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلس شان دار ہے۔

قریش کے سرداروں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت خبابؓ، حضرت بلالؓ، حضرت عمارؓ اور حضرت زیدؓ جیسے غلاموں اور محکوموں کو دیکھا تو آپ سے کہا کہ یہ ہیں آپ کے ساتھی۔ کیا پوری قوم میں سے یہی آپ کو ملے، کیا انھیں پر اللہ کا احسان ہوا ہے؟ کیا اس 'سرمایہ' سے آپ خوش اور مطمئن ہیں؟ اگر آپ ان کو ہٹادیں تو ہم آپ کی بات سن سکتے اور غور کرسکتے ہیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیال فرمایا اور بعض اصحاب نے بھی درخواست کی کہ یہ آپ کر کے دیکھ لیں کہ فی الواقع کیا نتیجہ نکلتا ہے۔[1]

قرآن مجید کم زوروں اور ضعیفوں کو سینے سے لگانے آیا تھا۔ اس نے سرداران قریش کو کوئی امتیازی حیثیت دینے سے انکار کر دیا اس لیے کہ اس سے ان کے جذبۂ نخوت کو تقویت مل رہی تھی اور حکم دیا:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَیْکَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِکَ عَلَیْهِمْ مِّنْ شَیْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَکُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ○ وَ کَذٰلِکَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ

جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوش نودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انھیں اپنے سے دور نہ پھینک دو۔ ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر ہے اور نہ تمھارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر ہے۔ اس پر بھی اگر تم انھیں دور کردو گے تو تمھارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمائش میں

[1] ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر: ۲/۱۳۴۔ تفسیر المنار: ۷/۴۳۳۔ قرطبی، الجامع الاحکام القرآن جلد ۳، جزء ۶، ص ۸-۴۲۷-۹

بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ۝ (الانعام:۵۲-۵۳)

ڈالا ہے تاکہ وہ انھیں دیکھ کر کہیں کہ کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے۔ ہاں! کیا خدا اپنے شکر گزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۝

(الکہف:۲۸)

اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھو (ان کی رفاقت اور معیت پر مطمئن رہو) جو اپنے رب کو اس کی رضا کی طلب میں صبح و شام پکارتے ہیں۔ تمھاری آنکھیں حیاتِ دنیا کی زیب و زینت کی تلاش میں ان سے ہٹنے نہ پائیں۔ تم اس شخص کی بات نہ مانو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہے، جو اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور جس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔

اس طرح سماج کے جو کم زور افراد اور طبقات اسلام کی طرف کھنچ کر آرہے تھے اسلام ان کو عزت و احترام کے ساتھ آگے بڑھ کر اپنے آغوش میں لے رہا تھا۔ وہ اِن کم زوروں اور مظلوموں کو اُن جبابرۂ قریش کے مقابلہ میں عزت اور رفعت کا مقام دے رہا تھا اور انھیں اپنا سرمایہ سمجھ رہا تھا جن کے سر حق و صداقت کے سامنے تو جھکنے کے لیے تیار نہیں تھے، البتہ حق و صداقت کو وہ اپنی ہوا و ہوس کا تابع دیکھنا چاہ رہے تھے۔

نظامِ شریعت میں کم زور کی رعایت

اسلام نے کم زور کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس کا تعلق خود اس کی ذات سے بھی ہے، معاشرہ اور ریاست سے بھی ہے۔

مذہب کے نام کے ساتھ پوجا پاٹ، ریاضت و مشقت اور رسم و رواج کی بندشوں اور صعوبتوں کا تصور ابھرنے لگتا ہے اور آدمی سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ مذہب اس کی اصلاح و تربیت اور اس کے دکھ درد کا علاج ہے یا تعذیبِ نفس اور روحانی کلفت کا سامان۔ اس کی جانِ ناتواں اور کم زور جسم، دنیا کے بوجھ کے ساتھ مذہب کا بوجھ بھی اٹھا سکتے ہیں یا نہیں؟ پھر وہ مایوسی کے بعد، کبھی اسے بدنصیبی سمجھ کر اور بیش تر حالات میں خوش بختی تصور کرکے مذہب کا جوا اتار پھینکتا ہے اور ہر بندش سے آزاد ہوکر دنیا کے جھمیلوں میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ اگر مذہب کی بندشوں کو توڑنے کی ہمت نہ کرے تو دنیا کے چھوڑنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

اسلام نے دین اور مذہب کے نام پر جو بے جا سختیاں تھیں انھیں ختم کیا۔ قرآن مجید اپنے لانے والے پیغمبر ﷺ کا ایک خاص وصف ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف:۱۵۷)

ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نازل کرنے والا

انتہائی حکیم و دانا اور بڑا ہی رحیم و کریم ہے۔ وہ انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں سے بھی واقف ہے اور اس کی کم زوریوں، مجبوریوں اور ناتوانائیوں کو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کی تعلیمات مرد اور عورت، جوان اور بوڑھے، عالم اور جاہل، حاکم اور محکوم، امیر اور غریب، مزدور اور مالک، مریض اور تن درست، مسافر اور مقیم سب کے لیے ہیں اور سب کی رعایت اس میں کی گئی ہے۔

ذمہ داری بہ قدرِ استطاعت

اسلام میں ذمہ داریوں کی بنیاد استطاعت پر ہے۔ جس شخص کے اندر جتنی طاقت ہے اتنی ہی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اور جو چیز اس کی استطاعت سے باہر ہے وہ اس کی ذمہ داری سے بھی خارج سمجھی گئی ہے۔ قرآن بڑی صراحت کے ساتھ کہتا ہے۔

لاَ یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلاَّ وُسْعَھَا ؕ

اللہ کسی نفس پر اس کی استطاعت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ (البقرہ:۲۸۶)

وسعت اور گنجائش اور طاقت اور امکان میں فرق ہے۔ ایک شخص ہوسکتا ہے کہ سو پچاس کلو کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد کر پانچ سات کلومیٹر چلا جائے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوگا جبکہ وہ اپنی پوری توانائی صرف کردے۔ بہت ممکن ہے اس سے اس کی کمر ٹوٹ جائے اور وہ مزید بوجھ اٹھانے کے قابل ہی نہ رہے۔ اسے وسعت نہیں کہا جاتا۔ وسعت یہ ہے کہ آدمی کسی کام کو بہ سہولت کر سکے اور اسے انجام دینے میں اسے غیر معمولی زحمت اور مشقت نہ اٹھانی پڑے۔ ایک جگہ اسی کو عدم حرج سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ

اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ (الحج:۷۸)

'حرج' ایسی گنجان جھاڑی کو کہا جاتا ہے جس میں گھسا نہ جاسکے۔ اسی سے حرج کے معنی انتہائی تنگی کے آتے ہیں۔ مطلب یہ کہ شریعت میں ایسی تنگی یا دشواری نہیں

ہے کہ اس پر عمل نہ ہو سکے۔ چناں چہ جب کسی کے لیے کوئی عمل سخت دشوار ہو جاتا ہے تو حرج کو رفع کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں۔

بعثت بالحنيفة السمحة[1] — مجھے دین حنیف دے کر بھیجا گیا ہے جس میں سہولت اور آسانی ہے۔

قرآن میں تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن:۱۶) — اللہ سے ڈرو جتنی کہ تمھارے اندر استطاعت ہے۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔

اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشيئٍ فأتوا منه ما استطعتم و اذا نهيتكم عن شيئ فدعوه[2] — جب میں تمھیں کسی چیز کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کی حد تک اس پر عمل کرو اور جب کسی چیز سے منع کروں تو اس سے باز رہو۔

پوری شریعت کی بنیاد اسی استطاعت اور عدم حرج پر رکھی گئی ہے۔ یہی اصول کم زور کے سلسلہ میں بھی اس نے برتا ہے۔ اس نے بیماری، جسمانی معذوری، ضعیفی، پیری، سفر کی زحمتوں اور مالی مشکلات وغیرہ کی اپنے تمام احکام میں پوری پوری رعایت کی ہے اور جس کام کو جس حد تک انسان انجام دے سکے اتنی ہی اس پر اس کی ذمہ داری بھی ڈالی ہے اور جہاں جو حکم اس کی طاقت سے باہر ہو اس سے اسے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ شریعت کے اس اصول کو علامہ ابن حزمؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وكل فرض كلفه الله تعالىٰ الانسان فان قدر عليه لزمه و ان عجز عن جميعه سقط عنه و ان قوى علىٰ بعضه و عجز عن بعضه — ہر وہ فرض جس کا اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکلّف بنایا ہے اگر اس کے ادا کرنے کی اس میں طاقت ہے تو وہ پورا کا پورا اس پر لازم ہوگا۔ اگر وہ اس سے بالکلیہ عاجز ہے تو وہ فرض بھی بالکل ہی اس سے ساقط ہو جائے گا، لیکن اگر اس کا ایک حصہ ادا

---

[1] مسند احمد: ۵/۲۶۶

[2] صحیح مسلم: کتاب الحج، باب فرض الحج مرۃ فی العمر

سقط عنه ما عجز عنه و لزمه ما قدر عليه منه سواء اقله او اکثره[1]

کرسکتا اور ایک حصہ ادا نہیں کرسکتا ہے تو جتنا حصہ اس سے نہیں ادا ہوسکتا وہ ساقط ہوجائے گا اور جو حصہ ادا کرسکتا ہے اس کا ادا کرنا اس پر لازم ہوجائے گا۔ چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔

عبادات میں کم زور کی رعایت

شریعت کا یہ اصول نماز روزہ جیسی عبادات سے لے کر معاشی، سماجی اور سیاسی احکام تک ہر گوشے میں کارفرما ہے۔ اسلام میں عقائد کے بعد عبادات کا مقام ہے۔ ان میں بھی نماز کی اہمیت دوسری عبادات سے زیادہ ہے۔ نماز کے لیے طہارت اور پاک صاف ہونا شرط ہے۔ اسی کے لیے وضو اور غسل رکھے گئے ہیں۔ لیکن اگر آدمی وضو یا غسل نہ کرسکے یا پانی دستیاب نہ ہو تو حکم ہے کہ تیمّم کرلے۔ نماز میں آدمی تھوڑی دیر خدا کے دربار میں کھڑا ہوتا ہے، رکوع اور سجدہ کرتا ہے، با ادب بیٹھ کر تسبیح وتحمید کرتا ہے۔ یہ دوسرے مذاہب کی عبادتوں اور ریاضتوں کے مقابلے میں نہایت آسان عمل ہے۔ اس پر بھی جو شخص کھڑا ہوکر نماز نہ پڑھ سکے، اسے بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت ہے۔ اگر بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکے تو لیٹ کر اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو صرف اشاروں سے یہ فرض ادا کرسکتا ہے۔ نماز پانچ متعین اوقات میں فرض ہے۔ آدمی ان اوقات میں سوجائے یا بھول جائے تو جب بیدار ہو اور یاد آئے یہ فرض ادا کرلے۔ ہاں قصداً کوتاہی جائز نہیں ہے۔ فرض نمازیں مسجد میں امام کی اقتدا میں ادا کی جاتی ہیں۔ امام کو ہدایت ہے کہ وہ کم زوروں کی رعایت کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

مَنْ اَمَّ قَوْمًا فليخفّف فان فيهم الكبير و ان فيهم المريض و ان فيهم الضعيف و ان فيهم ذا الحاجة[2]

جو شخص کسی جماعت کی امامت کرے تو ہلکی اور مختصر نماز پڑھائے، اس لیے کہ جماعت میں بوڑھے، مریض، حاجت مند ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔

---

[1] المحلّی: ۱/۶۹ [2] مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب امر الائمۃ بتخفیف الصلوٰۃ فی تمام۔ اس مفہوم کی روایتیں صحاح کی اور کتابوں میں بھی ہیں۔

روزے یا برت رکھنے کی تعلیم ہر مذہب میں موجود ہے۔ مسلسل کئی کئی روز کے برت کا بھی رواج ہے۔ لیکن اسلام نے کہا کہ روزہ صرف طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک ہوگا، اس سے زیادہ نہیں۔ صرف ایک مہینہ کا ہوگا، زندگی بھر کا نہیں۔ اس کے باوجود جو شخص بیمار ہے یا سفر میں ہے، جو عورت حمل اور رضاعت کی تکلیف برداشت کررہی ہے انھیں اجازت ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں اس کی قضا کریں۔ جو شخص ضعیفی اور پیری کی وجہ سے بعد میں بھی روزہ نہ رکھ سکے تو کسی مسکین کو کھانا کھلادے۔ یہ اس کا کفارہ ہے۔ روزے کے سلسلہ کی رعایتوں کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلاَ يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ:۱۸۵)

اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا۔

زکوٰۃ اسلامی عبادات کا ایک اہم رکن ہے۔ یہ معاشرہ کی مالی اعانت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ لیکن زکوٰۃ ان ہی لوگوں پر فرض ہے جو ایک خاص مقدار میں دولت کے مالک ہوں۔ جن کے پاس اتنی دولت نہیں ہے ان کو اسلام نے زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ یہ اس طرح کا مذہبی ٹیکس نہیں ہے جو ہر شخص کو چارو ناچار ادا کرنا پڑے۔

حج بھی اسلام کی ایک اہم عبادت ہے جس میں آدمی اسلام کے مرکز (مکہ) پہنچ کر روحانی فیض حاصل کرتا ہے۔ اس کے لیے بھی استطاعت شرط ہے۔ اگر استطاعت نہیں ہے تو حج فرض نہیں ہوگا۔ استطاعت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جسمانی طور پر بھی اور مالی لحاظ سے بھی اس لمبے سفر اور وہاں کی تگ و دو کے قابل ہو۔ قرآن میں ہے۔

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً (آل عمران:۹۷)

اللہ کے لیے لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے جو کہ وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔

مالی ذمے داری بہ قدرِ استطاعت

خاندانی نظام میں مرد پر مالی ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کے سلسلہ میں اسلام کا اصول ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

لِیُنۡفِقۡ ذُوۡ سَعَةٍ مِّنۡ سَعَتِهٖ ؕ وَ مَنۡ قُدِرَ عَلَیۡهِ رِزۡقُهٗ فَلۡیُنۡفِقۡ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ سَیَجۡعَلُ اللّٰهُ بَعۡدَ عُسۡرٍ یُّسۡرًا ﴿۷﴾

(الطلاق:۷)

خوش حال اپنی خوش حالی کے مطابق خرچ کرے اور جس کو رزق کم دیا گیا ہو وہ اسی مال سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اس سے زیادہ کا اسے وہ مکلف نہیں کرتا۔ بعید نہیں کہ اللہ تنگ دستی کے بعد فراخی عطا فرمادے۔

معذور پر جہاد فرض نہیں ہے

اسلام میں جہاد کا تصور یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے وقتِ ضرورت جان بھی قربان کرے اور مال بھی۔ لیکن جو شخص جسمانی طور پر معذور ہے اس سے جان لڑانے کا اور جس کے پاس مال نہیں ہے اس سے مال خرچ کرنے کا مطالبہ نہیں ہے۔ ہاں جو شخص استطاعت کے باوجود پیچھے رہ جائے وہ گنہ گار ہوگا۔ اس سلسلہ میں حسبِ ذیل آیتوں سے اسلام کا مزاج سمجھا جاسکتا ہے۔

لَیۡسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَی الۡمَرۡضٰی وَ لَا عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ مَا یُنۡفِقُوۡنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوۡا لِلّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ ؕ مَا عَلَی الۡمُحۡسِنِیۡنَ مِنۡ سَبِیۡلٍ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿ۙ۹۱﴾ وَّ لَا عَلَی الَّذِیۡنَ اِذَا مَاۤ اَتَوۡکَ لِتَحۡمِلَهُمۡ قُلۡتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحۡمِلُکُمۡ عَلَیۡهِ ۪ تَوَلَّوۡا وَّ اَعۡیُنُهُمۡ تَفِیۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ حَزَنًا اَلَّا یَجِدُوۡا مَا یُنۡفِقُوۡنَ ﴿ؕ۹۲﴾ اِنَّمَا السَّبِیۡلُ عَلَی الَّذِیۡنَ یَسۡتَاۡذِنُوۡنَکَ

نہ تو ضعیفوں پر، نہ مریضوں پر اور نہ ان لوگوں پر کوئی گناہ ہے جن کے پاس خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار کریں۔ (واقعہ یہ ہے کہ) اس طرح کے نیکوکاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ غفور و رحیم ہے اور نہ ان لوگوں پر کوئی الزام ہے کہ جب وہ تمھارے پاس اس درخواست کے ساتھ آئے کہ تم انھیں سواریاں فراہم کردو تو تم نے ان سے کہہ دیا کہ میں تمھارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کرسکتا تو وہ اس غم میں کہ ان کے پاس اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے، اس طرح واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے۔

وَ هُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (التوبہ:۹۱-۹۳)

الزام تو ان لوگوں پر ہے جو دولت مند ہونے کے باوجود تم سے جہاد میں شریک نہ ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔ وہ خوش ہیں کہ پیچھے رہ جانے والوں میں وہ بھی رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے لیکن وہ نہیں جانتے[1]

صبر کی تلقین

کم زوری، جسمانی، مالی، علمی، معاشی، سیاسی جس نوعیت کی بھی ہو اسلام صبر کی تلقین کرتا ہے۔ دینی اصطلاحات آج اپنی ساری معنویت کھوچکی ہیں۔ لوگوں نے مجبوری کا نام صبر رکھ چھوڑا ہے۔ اس لیے صبر کا لفظ سنتے ہی بے عملی، پست ہمتی اور حالات کے سامنے سپر انداز ہوجانے اور بے دست و پا بن کر بیٹھ رہنے کا تصور ابھرتا ہے، حالاں کہ صبر، استقامت اور بلند حوصلگی کا نام ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی حالات کا جم کر مقابلہ کرے اور شکست کھا بھی جائے تو ہمت نہ ہارے اور تازہ دم ہوکر اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھے۔ صبر فتح و کام رانی کی کلید ہے۔ صبر آدمی کو نئی زندگی اور نئی توانائی عطا کرتا ہے۔ صبر کسی ایک میدان میں نہیں، زندگی کے ہر شعبے میں مطلوب ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی زندگی کی اعلیٰ قدروں کو اختیار کرے اور ان کے لیے مسلسل قربانی دے۔ صبر یہ بھی ہے کہ نفس کی خواہشات، خاندان کی غلط روایات، معاشرہ کی بری عادات و اطوار اور اخلاقی خرابیوں کا مقابلہ کرے اور اپنی سیرت پر گندگی کے چھینٹے آنے نہ دے۔ صبر یہ بھی ہے کہ آدمی شدائد و مشکلات میں ثابت قدم رہے اور کوئی ایسا اقدام نہ کر بیٹھے جو اس کو بلندی سے نیچے اتار پھینک دے۔ صبر یہ بھی ہے کہ آدمی مصائب و آلام میں ہوش و حواس نہ کھو بیٹھے اور اللہ کے فیصلہ کو خوش دلی سے برداشت کرے۔ جب تک صبر کا

---

[1] اس کی تفصیل راقم کے ایک مضمون میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو "معذور پر جہاد فرض نہیں ہے" سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ۔ جنوری - مارچ ۲۰۰۴ء

وصف نہ ہو آدمی فکری، علمی، اخلاقی، معاشی، سماجی کسی بھی پہلو سے اوپر نہیں اٹھ سکتا۔ عظمت و رفعت اس دنیا میں صابروں کے حصہ میں آتی ہے۔

قرآن مجید میں ہر آزمائش اور امتحان کے موقعہ پر صبر کی تعلیم دی گئی ہے اور اسے دنیا کی کام یابی کے ساتھ آخرت کی کام یابی کا بھی ذریعہ بتایا گیا ہے۔ اس سلسلہ کی تمام تصریحات پیش کرنے کی یہاں ضرورت نہیں محسوس ہوتی، صرف ایک حوالہ دیا جارہا ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝ (البقرہ: ۱۵۵-۱۵۷)

ہم ضرور تم کو آزمائیں گے خوف سے، بھوک سے، مالوں، جانوں اور پھلوں کے نقصان سے۔ اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنادو جن کا حال یہ ہے کہ جب کوئی تکلیف انھیں پہنچتی ہے تو اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہتے ہیں۔ ان پر ان کے رب کی عنایات ہیں اور رحمت ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

جن لوگوں کا آخرت ہی پر ایمان نہیں ہے وہ وہاں کی کام یابی اور اجر وثواب پر بھلا کیا یقین کرسکتے ہیں؟ وہ اسے محض ایک ایسی جھوٹی تسلی سمجھیں گے، بلکہ فی الواقع سمجھتے ہیں جو سادہ لوح عوام کو بہلانے کے لیے دی گئی ہے۔ آخرت کے امکان سے یہاں بحث نہیں ہے، صرف ایک پہلو کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ وہ یہ کہ آخرت کے اجر و ثواب کا تصور انسان کو محرومی کے احساس سے بچاتا ہے۔ جس شخص کو آخرت پر یقین ہو وہ کبھی دل شکستہ، مایوس اور نا امید نہیں ہوتا۔ وہ بڑے سے بڑے نقصان کو بھی بہتر اجر و ثواب کی توقع پر بہ خوشی برداشت کرسکتا ہے۔ ورنہ اس دنیا میں جہاں انسان کو ہمت شکن حالات اور دل و دماغ کو ہلادینے والے صدمات کا سامنا کرنا پڑتا رہتا ہے، وہ ثابت قدم

نہیں رہ سکتا۔ ایک شخص جو اپنی بینائی کھوچکا ہو اس کے لیے اس دنیا کی ساری رونقیں بے معنیٰ ہیں۔ لیکن اگر وہ اس یقین کے ساتھ جینے کا فیصلہ کرے کہ آج وہ جس نعمت سے محروم ہے کل نہ صرف یہ کہ وہ اسے عطا ہوگی بلکہ بہترین اجر وثواب سے بھی اسے نوازا جائے گا تو اس محرومی میں بھی وہ سکون اور اطمینان محسوس کرے گا اور ہمت کے ساتھ کارزارِ حیات میں اپنا حصہ ادا کرے گا۔ ایک شخص جس کا جواں سال اور اکلوتا بچہ کسی حادثہ کا شکار ہوگیا ہو اس کے لیے اس بھری دنیا میں کوئی کشش نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ یہ سوچ کر زندگی گزارے کہ اس صدمہ کا صلہ اسے جنت کی شکل میں ملنے والا ہے اور وہاں اس کا بچہ اسے مل بھی جائے گا تو اس نقصان میں بھی اسے نفع کا احساس ہوگا۔ آخرت پر ایمان اور یقین یہی تصور انسان کے اندر پیدا کرتا ہے۔[1]

---

[1] اس موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''اسلام اور مشکلاتِ حیات''۔

کم زور کی ظلم سے حفاظت[1]

ظلم کے لیے دنیا میں کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ اگر کسی ایک فرد پر بھی ظلم و زیادتی ہو تو پوری دنیا کا سر شرم سے جھک جانا چاہیے۔ لیکن یہاں افراد ہی پر نہیں بلکہ بڑے بڑے گروہوں پر جور وستم کے پہاڑ توڑے گئے ہیں۔ اس سے نہ تو ماضی کا دامن پاک تھا اور نہ حال کا دامن پاک ہے۔ ظلم کا نشانہ کم زور ہی بنتا ہے۔ یہ دنیا کی تاریخ ہے اور بڑی ہی دردناک تاریخ ہے کہ اشخاص نے بھی اور جماعتوں نے بھی اپنے سے کم زور افراد اور جماعتوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو لوٹا ہے اور بے دریغ لوٹا ہے۔ ان پر اس قدر جور وستم ڈھایا ہے کہ اس کے تصور سے بھی روح کانپ جاتی ہے۔ اب بھی یہ سب کچھ ہوتا ہے۔

---

[1] ظلم کی تعریف علماء نے یہ کی ہے کہ کسی چیز کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیا جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اس میں کمی بیشی یا اس کے وقت اور جگہ میں تبدیلی کر دی جائے۔ ظاہر ہے اس سے اس کی حیثیت اور افادیت میں فرق آجاتا ہے۔ ظلم کی تین قسمیں ہیں۔ ایک ظلم تو وہ ہے جس کا ارتکاب اللہ کی جناب میں انسان کرتا ہے۔ ان میں سب سے بڑا ظلم، کفر، شرک اور نفاق ہے۔ ظلم کی دوسری صورت وہ ہے جو ایک انسان دوسرے انسان پر کرتا ہے۔ ظلم کی تیسری صورت یہ ہے کہ انسان خود اپنی ذات کے ساتھ ظلم کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ تینوں طرح کے ظلم ایک لحاظ سے اپنی ذات ہی کے ساتھ ظلم ہیں۔ قرآن مجید میں ان تینوں طرح کے ظلم کا ذکر ہے۔ (راغب، مفردات القرآن ص ۳۱۸- ۳۱۹) اس جگہ اصلاً انسانوں پر انسانوں کی طرف سے ہونے والا ظلم زیر بحث ہے۔

اسلام سے قبل عرب میں کم زوروں کی حالت

اسلام جس معاشرہ میں آیا اس میں کم زور افراد اور طبقات دونوں ہی سخت مظالم کے شکار تھے۔ غلاموں اور محکوموں پر ان کے مالک اور آقا مشقِ ستم کر رہے تھے، عورتوں پر مردوں کی زیادتی ہورہی تھی، یتیموں کے حقوق ان کے نام نہاد سرپرستوں کے ہاتھوں پامال ہورہے تھے، وطن سے دور اجنبیوں اور مسافروں کی جان و مال ہر وقت خطرے میں رہتی تھی۔ معذوروں اور مجبوروں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ غرض یہ کہ ظلم کی چکی ہر طرف پوری قوت سے چل رہی تھی اور کم زور و بے کس انسان اس میں بری طرح پس رہے تھے۔ اس صورت حال کی تصویر کشی قرآن مجید نے ان الفاظ میں کی ہے۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَۙ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِۙ وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّاۙ وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّاؕ
(الفجر: ۱۷-۲۰)

ہرگز نہیں! تم یتیم کے ساتھ عزت کا سلوک نہیں کرتے ہو اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے ہو۔ میراث کا سارا مال خود سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بے حد محبت کرتے ہو۔

ہجرت حبشہ کے بعد حضرت جعفر طیارؓ نے نجاشی کے دربار میں جو بے نظیر تقریر کی تھی، اس سے اس معاشرہ کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے۔ انھوں نے فرمایا۔

ایھا الملک کنّا قوما اھل جاھلیۃ نعبد الاصنام و نأکل المیتۃ وَ نأتی الفواحش و نقطع الارحام و نسئ الجوار یأکل القویُّ منّا الضعیفَ

اے بادشاہ! ہم ایسی قوم تھے جو جاہلیت میں پڑی ہوئی تھی۔ بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بے حیائیوں کا ارتکاب کرتے تھے، خونی رشتوں کو کاٹ دیتے تھے۔ پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے۔ (غرض یہ کہ) ہم میں جو طاقت ور تھا وہ کم زور کو کھا رہا تھا۔

اسلام نے کم زوروں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی

اس کے بعد حضرت جعفرؓ نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور آپ کی تعلیم کا تعارف ان الفاظ میں پیش کیا۔

كنّا علىٰ ذٰلک حتىٰ بعث اللّٰه الينا رسولاً منا نعرف نسبهُ و صدقه و أمانته و عفافه فدعانا الى اللّٰه لنوحده و نعبده و نخلع ما كنا نحن نعبد و اٰباء نا من دونه من الحجارة والاوثان و امرنا بصدق الحديث و اداءِ الامانة وصلة الرحم و حسن الجوار والكف عن المحارم والدماء و نهانا عن الفواحش و قول الزور و اكل مال اليتيم و قذف المحصنة و امرنا ان نعبد اللّٰه وحده ولا نشرک به شيئا و امرنا بالصلوة والزكاة والصيام [1]

یہ تھی ہماری حالت۔ اس حالت میں اللہ نے ہمارے پاس ہم ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ ہم اس کے حسب نسب سے، اس کی صداقت و امانت اور پاک دامنی سے واقف ہیں۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف دعوت دی کہ ہم اسے ایک مانیں اور اس کی عبادت کریں۔ ہم اور ہمارے باپ دادا جن پتھروں اور بتوں کی عبادت کرتے ہیں ان سے کنارہ کش ہوجائیں۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ سچ بولیں، امانت ادا کریں، صلہ رحمی کریں، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ حرام کاموں سے بچیں اور خون نہ بہائیں، اس نے ہمیں بے حیائی کے کاموں سے، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا۔ اس نے ہم سے کہا کہ ہم صرف اللہ واحد کی عبادت کریں۔ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور اس نے نماز، صدقہ وخیرات اور روزہ کا حکم دیا۔

یہ ہے اسلام کی تصویر جو اس کے اولین عہد کے ایک داعی نے ایک بادشاہ کے سامنے پیش کی۔ اس میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اسلام اللہ واحد کی عبادت، شرک اور بت پرستی سے اجتناب اور اعلیٰ اخلاقی اقدار پر عمل کی دعوت دیتا ہے۔ وہ کم زوروں کے

---

[1] مسند احمد: ۱/۲۰۲۔ ۵/۲۹۱۔ ابن ہشام: ۱/۳۵۸-۳۵۹

ساتھ ہم دردی کا رویہ اختیار کرنے اور ان کے حقوق پہچاننے کی ہدایات لے کر آیا ہے اور ظلم و جور کی تمام راہیں بند کرنا چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا

ظلم کے استیصال کے لیے اسلام نے اس کی شناعت واضح کی، اس سے نفرت ابھاری اور اس کے خلاف ہر طرف ایسی فضا تیار کی کہ ظلم کرنے سے پہلے آدمی ہزار بار سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ معاشرہ اسے برداشت کرے گا بھی یا نہیں؟ اس نے سب سے پہلے تو یہ احساس پیدا کیا اور اسے زندہ رکھا کہ انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ وہ اعلیٰ اخلاقی رویہ اختیار کرنا چاہیے جو اس کائنات کے خالق و مالک کو پسند ہے۔ وہ نہ ظلم کرتا ہے اور نہ ظلم کو پسند کرتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ بات بڑی تکرار کے ساتھ کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ظلم سے پاک ہے۔ وہ کبھی کسی کے ساتھ کسی طرح کا ظلم نہیں کرتا۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ　　　بے شک اللہ تعالیٰ ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔

(النساء:۴۰)

ایک اور جگہ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا　　　یقیناً اللہ تعالیٰ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا۔

(یونس:۴۴)

اللہ تعالیٰ ظلم کو ناپسند کرتا ہے

یہی خوبی وہ اپنے بندوں کے اندر بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس بات کو سخت ناپسند کرتا ہے کہ اس کے بندے ظلم و ناانصافی کی راہ اختیار کریں اور ان کے درمیان جور و تعدّی کا بازار گرم رہے۔ قرآن مجید کی دو آیات کے آخری فقرے ملاحظہ ہوں۔

۱- وَلاَ تَعْتَدُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ لاَ یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَo (المائدہ:۸۷)

اور زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو نہیں پسند کرتا ہے۔

۲- وَاللّٰهُ لاَ یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَo (آل عمران:۱۴۰)

اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ایک حدیث قدسی میں یہی بات بڑے موثر انداز میں کہی گئی ہے۔

یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی و جعلته بینکم محرّما فلا تظالموا[1]

اے میرے بندو! میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام قرار دے رکھا ہے اور تمھارے درمیان بھی اسے حرام ٹھہرایا ہے۔ لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللّٰه اوحی الیَّ ان تواضعوا حتی لا یفخر احد علیٰ احد ولا یبغی احد علی احد[2]

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی فرمائی ہے کہ تم لوگ اس حد تک تواضع اور خاک ساری اختیار کرو کہ نہ تو کوئی کسی کے مقابلے میں گھمنڈ کرے اور نہ کوئی کسی پر زیادتی کرے۔

ظلم کرنے والوں کی مذمت

قرآن مجید نے یہود پر جن پہلوؤں سے سخت تنقید کی ہے، ان میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ظلم و زیادتی کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں اور ناجائز اور حرام طریقوں سے پیٹ بھرتے ہیں۔ فرمایا۔

تَریٰ کَثِیْرًا مِّنْهُمْ یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ اَکْلِهِمُ السُّحْتَ ط (المائدہ:۶۲)

اور اے محمدؐ تم ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ گناہ، ظلم و زیادتی اور حرام خوری پر خوب لپکتے ہیں۔

---

[1] مسلم: کتاب البر والصلہ، باب تحریم الظلم۔ مسند احمد: ۱۶۰/۵

[2] مسلم: کتاب الجنۃ، باب الصفات التی یعرف بہا ۔۔۔ یہ ایک لمبی حدیث کا فقرہ ہے۔ یہ فقرہ ابو داؤد میں بھی ہے۔ کتاب الادب، باب فی التواضع۔

طاقت ور کم زور پر ظلم نہ کرے

مال و دولت اور قوت و طاقت پا کر کم ظرف انسان سرکش ہو جاتا ہے۔ دوسروں کو دبانے اور غلام بنانے کے لیے اپنی طاقت استعمال کرنے لگتا ہے، حالاں کہ جو طاقت ور ہے اسی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے اور فی الواقع وہی اس حیثیت میں ہوتا ہے کہ بندگانِ خدا پر رحم کھائے اور بے کسوں اور لاچاروں کی مدد کرے۔ یہ بات تہذیب، اخلاق اور شرافت سے بہت دور اور سخت تکلیف دہ ہوتی ہے کہ جہاں سے خیر کا صدور ہونا چاہیے وہاں سے شر ظاہر ہو اور جس سے نفع کی امید کی جائے اس سے نقصان پہنچے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کو سخت ناپسند کرتا اور ان سے نفرت کرتا ہے۔ ایک وہ جو بڑھاپے میں بدکاری کرے، دوسرا وہ جو غربت اور محتاجی کے باوجود تکبر اور نخوت نہ چھوڑے، تیسرا وہ جو دولت پا کر جور و تعدی پر اتر آئے۔[۱]

اللہ تعالیٰ کا کوئی فیصلہ حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات غربت و افلاس میں اس کی طرف سے تنبیہ ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو۔ اس کے اندر سوز و گداز ابھرے اور وہ انانیت کو ختم کر کے پوری قوت سے اس کی طرف پلٹے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے کہ انسان اس تنبیہ سے فائدہ نہ اٹھائے اور مست مئے پندار رہے۔ اسی طرح دولت بھی ایک امتحان ہے۔ اس سے انسان کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ جو شخص ان ذمہ داریوں کو نہ پہچانے اور مال و دولت کے سہارے دوسروں پر ظلم کے تیر برساتا پھرے وہ خدا کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔

اس حدیث کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں غریب سے کہا گیا کہ غرور

---

۱ ترمذی، ابواب صفۃ الجنۃ، باب ماجاء فی صفۃ انھار الجنۃ۔ نسائی، کتاب الزکوۃ، باب ثواب من قد عفیٰ

اور گھمنڈ اسے زیب نہیں دیتا اور امیر کو ہدایت کی گئی کہ اس کا دامن جور و تعدی سے پاک ہونا چاہیے۔ اس طرح اسلام امیر اور غریب دونوں ہی کی اصلاح اور ایک خاص رخ سے ان میں سے ہر ایک کی تربیت چاہتا ہے۔

حذر از آہِ مظلوماں

کسی بے گناہ پر ستم ڈھانا اور اس کے جائز حقوق سے اسے محروم کرنا خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مظلوم کی آہ سے بچو، اس لیے کہ جب وہ فریاد کرتا ہے تو اس کی فریاد فوراً سنی جاتی ہے اور اس کی مقبولیت کی راہ میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو رسول اللہ ﷺ نے یمن کا گورنر مقرر کیا تو نصیحت فرمائی۔

اتق دعوة المظلوم فانه ليس بينه و بين الله حجاب[1]

مظلوم کی بد دعا سے بچو، اس لیے کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے۔

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

اياک و دعـوةَ المظلوم فانمـا يسال الله حقـه و ان الله لا يمنـع ذا حق حقـه[2]

مظلوم کی بد دعا سے بچو۔ اس لیے کہ وہ اللہ سے اپنا حق مانگتا ہے۔ اور اللہ کسی حق دار کا حق نہیں روکتا۔

کسی فاسق و فاجر اور بے دین اور کافر پر بھی ظلم کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی فریاد سنی جائے گی اور ظالم اس کی پکڑ سے بچ نہ سکے گا۔ چناں چہ ایک حدیث میں ہے۔

---

[1] بخاری: ابواب المظالم والقصاص، باب دعوة المظلوم۔ مسلم: کتاب الایمان، باب الدعاء الی الشھادتین وشرائع الاسلام۔

[2] مشکوٰۃ المصابیح: کتاب الآداب، باب الظلم بحوالہ بیہقی

دعوة المظلوم مستجابة و ان کان فاجرا ففجوره علی نفسه [۱]

مظلوم کی دعا سنی جاتی ہے چاہے وہ فاجر ہی کیوں نہ ہو، اس کے فجور کا تعلق اس کی ذات سے ہے وہ اس کی سزا پائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

اتقوا دعوة المظلوم و ان کان کافرا فانه لیس دونها حجاب [۲]

مظلوم کی اللہ سے آہ و فریاد سے بچو، چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ اس کی قبولیت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔

ثلثة لا ترد دعوتهم الصائم حین یفطر والامام العادل و دعوة المظلوم یرفعها اللّٰه فوق الغمام و تفتح لها ابواب السماء و یقول الرب و عزتی لانصرنّک و لو بعد حین [۳]

تین آدمیوں کی دعا (خدا کے دربار سے) رد نہیں ہوتی۔ روزہ دار کی دعا جب وہ (دن بھر کے روزے کے بعد) افطار کے وقت دعا کرتا ہے۔ امام عادل کی دعا اور مظلوم کی دعا کو تو اللہ تعالیٰ بادل کے اوپر اٹھا لے جاتا ہے۔ اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری عزت اور جلال کی قسم میں تیری ضرور مدد کروں گا کچھ وقت کے بعد ہی سہی۔

ظالم کو طاقت کے نشہ میں یہ خیال ہرگز نہ کرنا چاہیے کہ مظلوم بے یار و مددگار ہے۔ مظلوم کے ساتھ اللہ ہوتا ہے۔ اس کی فریاد اور آہ وفغاں بہ راہ راست عرشِ بریں تک پہنچتی ہے اور ظالم کسی بھی وقت اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بن سکتا ہے؟

ظلم کا انجام دنیا میں

قرآن وحدیث میں بار بار سمجھایا گیا اور تنبیہ کی گئی ہے کہ اس دنیا میں جب بھی جور و استبداد کا رویہ اختیار کیا گیا اور طاقت کے نشے میں اس حقیقت کو فراموش کردیا

---

۱ قال المنذری رواہ احمد باسناد حسن۔ الترغیب والترہیب: ۱۳۰/۳

۲ قال المناوی رواہ احمد و ابویعلی و الضیاء المقدسی و اسنادہ صحیح۔ التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۳۱/۱

۳ ترمذی: کتاب الدعوات، باب...

گیا کہ یہ کائنات بے خدا کے نہیں ہے بلکہ اس کا ایک مالک اور حاکم بھی ہے جو ظلم کو پسند نہیں کرتا اور ظالم کا پنجہ موڑ سکتا ہے، تو بڑے بھیانک اور درد ناک نتائج دیکھنے پڑے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

انّ اللّٰہ لیملی الظالم حتی اذا اخذہ لم یفلتہ

اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو وہ بچ کر نکل نہیں پاتا۔

اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَ کَذٰلِکَ اَخۡذُ رَبِّکَ اِذَا اَخَذَ الۡقُرٰی وَ ہِیَ ظَالِمَۃٌ اِنَّ اَخۡذَہٗۤ اَلِیۡمٌ شَدِیۡدٌ ۝[۱] (ھود:۶)

اور اسی طرح تیرے رب کی پکڑ تھی جب کہ اس نے ان بستیوں کو پکڑا جو ظلم کر رہی تھیں بے شک اس کی پکڑ درد ناک اور سخت ہوتی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

ما من ذنب أجدر أن یعجل اللّٰہ تعالی لصاحبہ العقوبۃ فی الدنیا مع ما یدخر لہ فی الاٰخرۃ مثل البغی و قطیعۃ الرحم[۲]

کسی پر ظلم کرنا اور خونی رشتہ کا کاٹنا یہ دو ایسے گناہ ہیں کہ کوئی دوسرا گناہ ان سے زیادہ اس کا مستحق نہیں ہے کہ اس کے ارتکاب کرنے والے کو اللہ تعالیٰ جلد اس دنیا ہی میں سزا دے، علاوہ اس عذاب کے جو اس نے آخرت میں ان کے لیے رکھا ہے۔

اگر انسان خدا کے قانون کو نہ سمجھے اور تاریخ سے عبرت نہ حاصل کرے تو وہ دوسروں کے لیے عبرت کا سامان بن جاتا ہے۔ جو شخص ظالموں کی صف میں کھڑا ہونا چاہے، اسے اس انجام بد سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی جو ظالموں کا ہمیشہ سے مقدر رہا ہے۔

---

۱ بخاری: کتاب التفسیر (سورہ ہود)۔ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم

۲ ابوداؤد: کتاب الادب، باب فی النہی عن البغی۔

ظلم کا انجام آخرت میں

یہ تو ہے ظلم کا انجام دنیا میں۔ آخرت میں ظالموں کا جو حشر ہوگا قرآن و حدیث میں اس کا بڑا دردناک نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ایک جگہ قرآن شریف میں ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۥ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۝ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ ۝ وَ اَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۝ وَّ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۝ (ابراہیم:۴۲-۴۵)

تم یہ نہ سمجھو کہ یہ ظالم جو کچھ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے غافل ہے۔ وہ ان کو اس دن تک کے لیے مہلت دے رہا ہے جب کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ سر جھکائے دوڑ رہے ہوں گے۔ نظریں (اوپر جمی ہوں گی) اور وہ ان کی طرف نہیں پلٹیں گی اور دل اڑ رہے ہوں گے۔ ان کو اس دن سے ڈراؤ جب کہ (واقعتہً) ان پر خدا کا عذاب آجائے گا۔ اس وقت ظالم کہیں گے۔ اے ہمارے رب ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور تیرے رسولوں کی اتباع کریں گے (ان سے کہا جائے گا) کیا تم نے اس سے پہلے قسم کھا کر نہیں کہا تھا کہ تم پر زوال نہیں آئے گا۔ حالاں کہ تم ان لوگوں کی بستیوں میں رہ چکے تھے جنھوں نے اپنے ساتھ زیادتی کی اور تم پر (یہ بھی) اچھی طرح واضح تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہم نے مثالیں دے کر تمھیں سمجھایا تھا۔[1]

ظلم میں ظلمت اور تاریکی کا مفہوم ہے۔ چناں چہ رسولِ خدا ﷺ نے ظلم کو ظلمتوں سے تعبیر فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

---

[1] قرآن مجید میں متعدد مقامات پر شرک اور کفر کو ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آخرت میں اس کا بدترین انجام سامنے آئے گا۔ ان آیات میں بھی اصلاً اسی کا ذکر ہے، لیکن شرک کے نتیجہ میں انسان اپنے ابناء نوع کے ساتھ جو غیر انسانی اور بہیمانہ روش اختیار کرتا ہے وہ بھی اس ظلم کے دائرہ میں آتا ہے۔ البتہ دونوں ظلم کی نوعیت میں فرق ہے۔ اس لیے ان کی سزا میں بھی فرق ہوگا۔

الظُّلْمُ ظلمات یوم القیامة [1] ظلم قیامت کے روز تاریکیاں ہوگا۔

مطلب یہ کہ قیامت کے روز ظالم کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ہوگی اور وہ اس روشنی سے محروم ہوگا جو جنت تک پہنچاتی ہے۔

اسی مفہوم کی ایک اور حدیث، حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اتقوا الظلم فان الظلم ظلمات یوم القیامة واتقوا الشح فان الشح اهلک من کان قبلکم حملهم علی ان سفکوا دماءهم واستحلّوا محارمهم [2]

ظلم سے بچو اس لیے کہ ظلم قیامت کے روز ظلمت بن کر آئے گا۔ بخل سے بچو اس لیے کہ بخل نے تم سے پہلے کے لوگوں کو ہلاک کیا۔ اس نے انھیں اس پر ابھارا کہ اپنے لوگوں کا خون بہائیں اور اللہ کی قائم کردہ محرمات کو توڑیں۔

اس حدیث میں ظلم سے منع کرنے کے ساتھ بخل اور کنجوسی سے بھی منع کیا گیا ہے۔ دونوں میں بڑا گہرا ربط ہے۔ ظلم ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آدمی مال پر سانپ بنا بیٹھا رہے اور حق داروں کا حق نہ ادا کرے۔ اس کے بڑے بھیانک نتائج نکلتے ہیں۔ جب لوگوں کے حقوق مارے جاتے ہیں اور ان کے جائز مطالبات پورے نہیں کیے جاتے تو معاشرہ میں لازماً کشیدگی اور بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے پورا معاشرہ آہستہ آہستہ فتنہ و فساد اور قتل و غارت گری کی لپیٹ میں اس طرح آجاتا ہے کہ اس سے نکلنا مشکل ہوجاتا ہے۔ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ اللہ نے کسی کو مال دیا ہے تو وہ ظلم و زیادتی کی راہ نہ اختیار کرے اور ہر حق دار کا حق ادا کرے، ورنہ وہ خود بھی تباہ ہوگا اور معاشرہ بھی برباد ہوگا۔ کتنی بڑی حقیقت ہے جو اس حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

آخرت میں ظلم معاف نہ ہوگا

حدیث میں آتا ہے کہ انسانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی وہ جرم ہے جو قیامت

---

[1] بخاری: کتاب المظالم والقصاص، مسلم: کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم

[2] مسلم: کتاب البر والصلہ، باب تحریم الظلم

کے روز معاف نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ظالم سے بدلہ لے گا اور مظلوم کو اس کا حق دلوائے گا۔ اس لیے ظالم کو اپنے ظلم کی تلافی اسی دنیا میں کر دینی چاہیے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (ظلم کے) دفاتر تین طرح کے ہوں گے۔ ایک دفتر وہ ہوگا جسے اللہ تعالیٰ بالکل معاف نہیں فرمائے گا۔ دوسرا دفتر وہ ہوگا، جس کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہمیت نہ ہوگی۔ وہ چاہے گا تو اسے معاف فرمادے گا۔ تیسرا دفتر وہ ہوگا جس کا اللہ تعالیٰ انتقام ضرور لے گا۔ جس ظلم کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا۔ وہ شرک ہے۔ چناں چہ خود اس نے فرمایا ہے۔ وَ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ (جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا) جس ظلم کو اللہ معاف فرمادے گا وہ ہے جس کا ارتکاب بندے خود اس کے سلسلہ میں کرتے ہیں، جیسے کسی نے کوئی روزہ چھوڑ دیا یا کسی وقت کی نماز نہیں پڑھی۔ اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے گا۔ وہ ظلم جس کا اللہ تعالیٰ ضرور حساب لے گا اور انصاف فرمائے گا وہ ہے جو بندے ایک دوسرے پر کرتے ہیں۔ اس کا قصاص لیے بغیر وہ نہیں چھوڑے گا۔ ظالم سے بدلہ لے گا اور مظلوم کو اس کا حق دلوائے گا۔[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ سے پوچھا۔ جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: مفلس وہ ہے جس کے پاس درہم و دینار اور مال و متاع نہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا۔ یہ نہیں۔

ان المفلس من امتی یأتی یوم القیامة بصلوٰة و صیام و زکوٰة و یأتی قد شتم ھٰذا و قذف ھٰذا و اکل مال ھٰذا و سفک دم ھٰذا و

میری امت میں (حقیقی) مفلس اور کنگال وہ شخص ہے جو قیامت کے روز نماز، روزہ، زکوٰۃ (سب کچھ) لے کر آئے گا لیکن اس کے ساتھ اس نے کسی کو برا بھلا کہا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا،

---

[1] مسند احمد: ۶/۲۴۰ و رواہ البیہقی فی شعب الایمان (مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب فی الظلم) وروی بمعناہ الطیالسی والبزار عن انس باسناد حسن (التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۲/۱۲۴)

ضرب هٰـذا فیعطی هٰـذا من حسناته و هٰـذا من حسناته فان فنیت حسناته قبل ان یقضٰی ما علیه اخذ من خطایاهم فطرحت علیه ثم طرح فی النار[۱]

(اس طرح دوسروں کی حق تلفی کی ہوگی) اللہ تعالیٰ اس کی کچھ نیکیاں ان میں سے ایک کو کچھ دوسرے کو دے دے گا۔ ان کا حساب ہونے سے پہلے اگر اس کی نیکیاں ختم ہوجائیں گی تو ان کے گناہ اس کے سر ڈال دیے جائیں گے اور اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

ظالم اپنے ظلم کی دنیا میں تلافی کرلے

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر کسی نے اپنے بھائی کو رسوا اور بے آبرو کیا ہے، اس کے مال و اسباب یا اور کسی چیز پر دست درازی کی ہے، غرض یہ کہ کسی کے ساتھ کوئی بھی ظلم کیا ہے تو دنیا ہی میں اسے معاف کرالے اور اس کی تلافی کردے، ورنہ قیامت کے روز جب کہ دینار و درہم نہ ہوں گے کہ کسی کو ان کے ذریعے خوش کیا جاسکے تو ظالم کے نیک اعمال اس کے ظلم کے تناسب سے مظلوم کو دے دیے جائیں گے۔ جب اس کا نامۂ اعمال نیکیوں سے خالی ہوجائے گا اور مظلوم کا حق باقی رہے گا تو مظلوم کے گناہ اس کے سر ڈال دیے جائیں گے۔[۲]

قرآن و حدیث سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے اسے لازماً اس سے توبہ کرنی چاہیے۔ اگر اس نافرمانی سے کسی بندہ کو نقصان پہنچا ہے تو توبہ کے ساتھ اس کی تلافی بھی ضروری ہے۔ کسی کو تکلیف یا اذیت پہنچانے، اس کا حق مارنے، اس کا مال کھانے یا اس کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی کے بعد محض اللہ سے توبہ کافی نہیں ہے، اس نقصان کو بھی پورا کرنا ہوگا جو دوسرے کو پہنچا ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں:

۱۔ مسلم: کتاب البر والصلہ، باب تحریم الظلم۔ ترمذی: ابواب صفۃ الجنۃ، باب ماجاء فی شان الحساب والقصاص۔

۲۔ بخاری کتاب المظالم والقصاص، باب من کانت لہ مظلمۃ

''علماء نے کہا ہے کہ ہر گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے۔ اگر اس کا تعلق خدا اور بندہ سے ہے اور کسی انسان کا حق ضائع نہیں ہوا ہے تو توبہ کی تین شرطیں ہیں: ایک یہ کہ آدمی اس گناہ سے باز آجائے جس کا وہ ارتکاب کر رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے کیے پر ندامت محسوس کرے۔ تیسرے یہ کہ اس بات کا عزم کرے کہ پھر اس کا اعادہ نہیں ہوگا۔ اگر ان میں سے ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو توبہ صحیح نہیں ہوگی۔ اگر معصیت کا تعلق انسانی حقوق سے ہے تو ان تین شرائط کے ساتھ ایک اور شرط کا اضافہ ہوگا۔ وہ یہ کہ جس کا جو حق مارا ہے وہ ادا کرے۔ اگر مالیات کی نوعیت کی کوئی چیز ہے تو اسے لوٹا دے، اگر تہمت لگائی ہے تو اسے مناسب انتقام کا موقع دے یا اس سے معافی طلب کرے، اگر غیبت کی ہے تو معافی تلافی کے ذریعہ اس سے چھٹکارا حاصل کرے۔''[1]

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

''امر حق یہ ہے کہ محض توبہ سے مظلوم کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ اس معاملہ میں قاتلوں اور دوسرے ظالموں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ توبہ اسی وقت مکمل ہوگی جب کہ ظلم کا عوض فراہم کیا جائے۔ اگر دنیا میں یہ نہ دیا جائے تو آخرت میں لازماً دینا پڑے گا۔''[2]

ظالم کا کوئی ساتھ نہ دے

ظلم کسی ایک فرد پر ہو رہا ہو یا جماعت پر، اس سلسلے میں معاشرہ پر بھی کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ معاشرہ کو ان ذمہ داریوں کا احساس نہ ہو یا وہ ان کو ادا نہ کرے تو اپنا حق مانگنے والوں اور دوسروں کا حق چھیننے والوں کے درمیان معرکے ہوتے

---

[1] ریاض الصالحین: باب التوبہ ص۲۴-۲۵

[2] فتاویٰ ابن تیمیہ طبع جدید: ۱۸/۱۸۷۔ اسی موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھی جائے امام غزالیؒ کی کتاب احیاء علوم الدین: ۲/۱۱۳-۱۱۹

رہیں گے اور کبھی ایک اور کبھی دوسرا غالب آتا رہے گا، لیکن ظلم و جور کا استیصال نہ ہوگا۔ برائیاں اس وقت مٹتی ہیں جب کہ پورا معاشرہ ان کے خلاف حرکت میں آجائے، ان کو قدم جمانے نہ دے اور جہاں کوئی برائی سر اٹھائے اسے کچل کر رکھ دے۔ اسلام ظلم کے خلاف اسی قسم کی فضا پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی سب سے پہلی ہدایت یہ ہے کہ کوئی شخص ظلم و زیادتی میں کسی کا ساتھ نہ دے اور ظالم کا کوئی تعاون نہ کرے۔

اوس بن شرحبیلؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من مشیٰ مع ظالم لیقویّہ و ھو یعلم انہ ظالم فقد خرج من الاسلام [1]	جو شخص ظالم کو ظالم جانتے ہوئے اسے تقویت پہنچانے کے لیے اس کے ساتھ چلے وہ اسلام سے خارج ہوگیا۔

حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

من اعان علی خصومۃ بظلم فقد باء بغضب من اللہ [2]	جس نے کسی جھگڑے میں ظلم کے ساتھ تعاون کیا وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا۔

مظلوم کا ساتھ دیا جائے

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ظالم سے عدم تعاون بھی مظلوم کے ساتھ ہم دردی ہے۔ بعض اوقات تو ظالم کے ساتھ آدمی کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں، ان مفادات کو چھوڑ دینا بڑی قربانی ہے، لیکن اس کے باوجود مظلوم کی مظلومی اس سے اونچے کردار کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ظالم کے مقابلے میں مظلوم کا ساتھ دیا جائے اور اس

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح: کتاب الآداب، باب الظلم بحوالہ بیہقی۔ قال المنذری رواہ الطبرانی فی الکبیر وھو حدیث غریب۔ الترغیب والترھیب: ۳/۱۳۸

[2] ابو داؤد: کتاب القضایا، باب فی الرجل یعین علی خصومۃ الخ۔ اسی مفہوم کی ایک روایت ابن ماجہ میں بھی ہے۔ ملاحظہ ہو ابواب الاحکام باب من ادعیٰ مالیس لہ۔

کی دست گیری اور مدد کی جائے۔ یہی کردار اسلام پیدا کرتا ہے۔ اس نے اس بات کی تعلیم دی اور تاکید کی کہ کسی کے ساتھ ظلم ہو رہا ہو تو اسے بے یارو مددگار نہ چھوڑا جائے بلکہ اس کی مدد کی جائے اور اسے ظالم کے پنجے سے چھڑایا جائے۔ اخلاق کی دنیا میں اس کا بھی ایک مقام ہے کہ انسان کسی کم زور پر دست درازی نہ کرے، لیکن یہ ایسا مقام ہے کہ وہ اس سے نیچے اتر آئے تو حیوان کی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کی انسانیت، اخلاق اور شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی درندہ صفت کسی بے بس اور مجبور شخص پر ہاتھ اٹھائے تو وہ ڈھال بن جائے اور اس کی چیرہ دستی کو روک دے۔ اسلام انسان کو انسانیت کے اسی مقام بلند تک پہنچاتا ہے۔ حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا اور سات باتوں سے منع فرمایا۔ ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ ہم مظلوم کی مدد کریں[۱]

اس حکم کی قانونی حیثیت کے بارے میں امام نووی لکھتے ہیں:

......امـــا نصـر المظلوم فمن فروض الكفايـة و هـو من جملة امر بالمعـروف والنهي عــن المنكر و انما يتوجَهُ الامر اليــه علٰى من قدر عليه ولم يخف ضررا[۲]	......رہا مظلوم کی مدد کرنا تو یہ ان احکام میں سے ہے جو فرض کفایہ ہیں۔ یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذیل میں آتا ہے۔ اس کے مخاطب (معاشرہ کے) وہ افراد ہیں جو اس کی طاقت رکھتے ہوں اور اس کی وجہ سے انھیں کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔

علاّمہ ابن دقیق العید کہتے ہیں۔

و نصـر المظلـوم من الفروض اللازمـة على من علـم بظلمـهٖ و	مظلوم کی مدد ان فرائض میں داخل ہے جو اس شخص پر لازم ہوتے ہیں جو جانتا ہو کہ کسی پر ظلم

---

۱ بخاری: کتاب الاشربۃ، باب آنیۃ الفضۃ۔ مسلم، کتاب اللباس۔

۲ شرح مسلم: مجلد ۷، جزء: ۱۴، ص ۲۸

قدر علی نصرہ و ھو من فروض الکفایات مما فیہ من ازالۃ المنکر و رفع الضرر من المسلم[1]

ہو رہا ہے اور وہ اس کی مدد کرسکتا ہے۔ یہ ان احکام میں سے ہے جو فرض کفایہ ہیں اس لیے کہ اس سے منکر کو مٹایا اور ایک مسلمان کو پہنچنے والے ضرر کو دور کیا جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی پر ظلم ہو رہا ہو تو جو شخص اس ظلم کو روک سکتا ہو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ آگے بڑھ کر اسے روک دے۔ یہ معاشرہ پر فرض کفایہ ہے۔ اگر کسی نے بھی یہ فرض انجام نہ دیا تو پورا معاشرہ گناہ گار ہوگا اور اللہ تعالیٰ کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ معاشرہ سے یہ فرض صرف اسی صورت میں ساقط ہوگا جب کہ یہ مان لیا جائے کہ اس میں ایک شخص بھی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور مظلوم کی حمایت میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رکھتا تھا یا اس کی وجہ سے ناقابل برداشت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اور وہ اس کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

ظالم کو ظلم سے روکا جائے

جب کوئی ستم گر اٹھ کر چاروں طرف تباہی مچا دے، بندگانِ خدا کا خون بہائے، ان کے حقوق چھین لے اور ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرنے لگے تو جو لوگ مذہبی یا با اخلاق سمجھے جاتے ہیں ان پر بالعموم دو طرح کے ردِّ عمل ہوتے ہیں۔ ایک ردِّ عمل سکوت اور خاموشی کا ہوتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان کی حیثیت تماشائی کی ہوتی ہے۔ اور ظلم کی زد دوسروں پر پڑتی ہے۔ دوسرا ردِّ عمل اس وقت ہوتا ہے جب کہ ظلم کے تازیانے خود ان پر برستے ہیں۔ یہ ردِّ عمل آہ و بکا اور فریاد و ماتم کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسلام نہ تو گونگی بہری دین داری کا قائل ہے اور نہ محض آہ و فغاں کو کافی سمجھتا ہے، اس لیے کہ آدمی چاہے یہ سوچ کر مطمئن ہو جائے کہ کسی ظلم و زیادتی میں اس کا ہاتھ نہیں ہے یا رو دھو کر دل کا بوجھ تھوڑا ہلکا کر لے، اس سے بہ ہر حال نہ تو ظلم

---

[1] اِحکام الاَحکام: ۴/۲۱۸

مٹ سکتا ہے اور نہ عدل و انصاف وجود میں آسکتا ہے۔ ظلم کی بھی ایک طاقت ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ طاقت ور ہی ظلم کرتا ہے۔ اس کا توڑ کرنے کے لیے اس کے خلاف علم اٹھانا، اس کے مقابلے میں سینہ سپر ہونا، اس کے لیے جان و مال لٹانا اور بڑی جدو جہد کرنی پڑتی ہے۔ تب حق داروں کو حق ملتا ہے، مظلوموں کی دادرسی ہوتی ہے اور بڑی بات یہ کہ اپنا فرض ادا ہوتا ہے۔ مومن کی یہی شان بتائی گئی ہے کہ وہ ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا اور اسے ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر یہ امت اس شان اور عزم و حوصلہ کے اہل ایمان سے خالی ہوجائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی زندگی کھوچکی اور اس کی اخلاقی موت واقع ہوگئی۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔

اذا رأیتم امتی تهاب الظالم ان تقول له انک انت الظالم فقد تودع منهم[1]

جب تم دیکھو کہ میری امت ظالم سے یہ کہتے ڈر رہی ہے کہ تم ہی ظالم ہو تو سمجھ لو کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے اس کے لیے بڑی جرأت و ہمت اور ایمانی طاقت کی ضرورت ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے اور اس راہ میں جان دینا سب سے بڑی شہادت ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ظالم کے خلاف اس طرح کے جاں باز اور اصحاب عزم نہ اٹھیں تو ظلم پھولے پھلے گا اور اس کے نتائج بد بھی سامنے آکر رہیں گے۔ خدائے تعالیٰ ظلم کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ جب وہ حد سے بڑھ جاتا ہے تو اس کا عتاب آتا ہے اور برے بھلے سب ہی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے حدیث میں تاکید کی گئی ہے کہ ظلم کو ابھرنے اور پنپنے نہ دیا جائے، ورنہ پورا سماج تباہ ہوکر رہے گا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہے:

---

[1] مسند احمد: ۲/۱۶۳، ۱۹۰۔ اس سلسلہ کی مزید روایات راقم کی کتاب 'معروف و منکر' میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ان الناس اذا رأوا الظالم فلم یاخذوا علیٰ یدیه اوشکَ ان یعمّهم اللّٰه بعقاب منه [1]

جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے نہ روک دیں تو بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ان سب پر عذاب عام نازل کردے۔

کسی گروہ کو ظلم کرنے نہ دیا جائے

اس طرح اسلام یہ چاہتا ہے کہ جب بھی کسی فرد پر ظلم ہو تو معاشرہ اس کی حمایت میں کھڑا ہو جائے اور ظلم کو روکنے کی پوری کوشش کرے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ایک فرد ہی نہیں کوئی ایک گروہ دوسرے گروہ پر جور و ستم ڈھانے لگے۔ یہ محض امکان ہی نہیں، دنیا کی تاریخ اس طرح کے جور و ستم سے بھری پڑی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں خدانخواستہ کبھی یہ صورت پیش آئے تو دیکھیے قرآن مجید کا کیا حکم ہے؟

وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ○ (الحجرات:۹-۱۰)

اور اگر ایمان والوں میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح صفائی کرادو۔ لیکن اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو تم اس گروہ سے جنگ کرو جو زیادتی کرے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ جب وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مسلمان تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ پس اپنے دو بھائیوں میں (جب جھگڑا ہو تو) صلح کرادو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

---

[1] ترمذی: ابواب الفتن، باب ما جاء فی نزول العذاب اذا لم یغیر المنکر۔ ابو داؤد: کتاب الملاحم، باب الامر والنہی۔

و ان طائفتان من المومنین اقتتلوا... الآیہ (اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں...) یہ انداز بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی کسی بھی دو جماعتوں میں اختلاف کو لڑائی جھگڑے کی شکل نہیں اختیار کرنی چاہیے۔ یہ ایک اتفاقی بات ہی ہوسکتی ہے کہ وہ آپس میں لڑ پڑیں۔ آیت کے الفاظ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حقیقت حال کے واضح ہونے کے بعد کسی گروہ کا صلح کی کوششوں کو قبول نہ کرنا اور اس کے خلاف بغاوت کر بیٹھنا مسلمانوں میں شاذ و نادر ہی ہوسکتا ہے۔ یہ ان کے درمیان عام بات نہ ہوگی۔[1]

اس آیت سے حسب ذیل اصولی باتیں نکلتی ہیں۔

۱- مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو فرمایا گیا فَاَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (ان کے درمیان صلح کرادو) اس کے لیے نصیحت کی جائے، غلط فہمیوں کو دور کیا جائے، نزاع اور اختلاف کے نقصانات بیان کیے جائیں۔ اتحاد اور محبت کے فوائد سمجھائے جائیں، اثر و رسوخ استعمال کیا جائے، یعنی جو بھی کوشش کی جائے وہ اسلام کے نزدیک پسندیدہ اور بڑے اجر و ثواب کی مستحق ہے۔ حضرت ابو درداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے سوال کیا کہ کیا میں تمھیں وہ عمل نہ بتاؤں جو (نفل) روزے، صدقے اور نماز سے (بھی) زیادہ فضیلت رکھتا ہے؟ ہم نے عرض کیا: ضرور بیان فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا۔

اصلاح ذات البین فان فساد ذات البین ھی الحالقة[2]

وہ ہے لوگوں کے تعلقات کو ٹھیک کرنا اور ان کے اختلافات کو دور کرنا۔ رہا لوگوں کے تعلقات کو بگاڑنا تو یہ انسان کی نیکیوں کو مونڈ دینے والا عمل ہے۔

۲- یہ صلح و صفائی عدل و انصاف اور اللہ کی کتاب کے مطابق ہوگی۔ اس

---

[1] رازی، التفسیر الکبیر جلد ۱۴ جزء ۲۸ ص ۱۰۹-۱۱۰

[2] ترمذی: ابواب صفة القیامة، باب... ابو داؤد: کتاب الآداب، باب فی اصلاح ذات البین۔

سے قطع نظر کہ کس فریق کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے اور کس کو نقصان؟ علامہ بغوی کہتے ہیں:

فاصلحوا بینھما بالدعاء الی حکم کتاب اللّٰہ والرضا بما فیہ لھما و علیھما [۱]

ان کے درمیان صلح کرادو۔ انھیں اس بات کی دعوت دے کر کہ اللہ کی کتاب جو حکم دے اسے مان لیں اور اس کے فیصلہ کو بہ خوشی قبول کرلیں چاہے وہ ان کے حق میں جائے یا ان کے خلاف۔

۳- محض جھگڑے کو ختم کردینا کافی نہیں ہے بلکہ عدل و انصاف اور اللہ کی مرضی کے مطابق اس کا فیصلہ ضروری ہے، تاکہ مظلوم کو اس کا حق ملے اور اسبابِ نزاع ختم ہوں، اس لیے کہ اگر اسباب اپنی جگہ باقی رہیں تو کسی بھی وقت دوبارہ نزاع ابھر سکتی ہے۔ علامہ ابو السعود کہتے ہیں:

فاصلحوا بینھما بالعدل بفصل ما بینھما علی حکم اللّٰہ تعالٰی ولا تکتفوا بمجرد متارکتھما عسٰی ان یکون بینھما قتال فی وقت اٰخر [۲]

ان کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرو۔ وہ اس طرح کہ اللہ کے حکم کے مطابق ان کے اختلاف کا فیصلہ چکادو۔ محض ان سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر اکتفا نہ کرو ورنہ ہوسکتا ہے کہ کسی دوسرے وقت ان کے درمیان جھگڑا ہوجائے۔

۴- نزاع اور اختلاف کے بعد عدل و انصاف سے ہٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے اس لیے اس پر خاص طور پر زور دیا گیا تاکہ کسی بھی مرحلہ میں عدل و انصاف سے سرمو انحراف نہ ہونے پائے۔ علامہ ابو السعود کہتے ہیں:

---

[۱] بغوی، تفسیر۔ یہی بات خازن میں بھی کہی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو التفسیر الخازن مع تفسیر البغوی: ۵۲۲/۵-۵۲۳

[۲] تفسیر ابی السعود علی ہامش الرازی: ۷/۷۵۳۔ یہی بات روح المعانی میں بھی کہی گئی ہے، جزء ۱۵۰/۲۶

و تقیید الاصلاح بالعدل لانه مظنة الحیف لوقوعه بعد المقاتلة و قد اکدَّ ذٰلک حیث قال و اقسطوا ای واعدلوا فی کل ما تأتون وما تذرون [۱]

(دوبارہ) اصلاح کے حکم کے ساتھ عدل کی قید اس لیے لگائی ہے کہ جنگ کے بعد جو صلح صفائی ہوگی اس میں نا انصافی کا اندیشہ ہے، پھر اس کی مزید تاکید کے طور پر فرمایا واقسطوا یعنی جو کچھ تم کرو اور جو نہ کرو سب میں انصاف کا رویہ اختیار کرو۔

۵- فریقین میں سے ایک ظلم و زیادتی پر اصرار کرے اور حق و انصاف کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہ ہو تو مظلوم گروہ کی حمایت ضروری ہے، تاکہ بہ زور اس کا حق اسے ظالم سے دلایا جاسکے۔ علامہ ابو السعود کہتے ہیں:

یجب معاونة من بغی علیه بعد تقدیم النصح والسعی فی المصالحة [۲]

خیر خواہی اور مصالحت کی کوشش کے بعد اس شخص کی معاونت ضروری ہے جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔

۶- جو گروہ ظلم و زیادتی کرے اس کے خلاف طاقت اس وقت استعمال کی جائے گی جب کہ اصلاح کی کوشش ناکام ہوجائے۔ اس سے پہلے طاقت کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ علامہ ابوبکر جصاص حنفی کہتے ہیں:

امر اللّٰه تعالٰی بالدعاء الٰی الحق قبل القتال ثم ان ابت الرجوع قوتلت [۳]

اللہ تعالیٰ نے قتال سے پہلے حق کی طرف بلانے کا حکم دیا ہے پھر اگر وہ حق کی طرف رجوع سے انکار کردے تو اس سے قتال کیا جائے گا۔

علامہ ابن عربی مالکی کہتے ہیں:

---

[۱] ابو السعود: تفسیر ۷/۵۳۔ یہی الفاظ روح المعانی کے بھی ہیں ۲۶/۱۵۰

[۲] تفسیر ابی السعود: ۷/۵۷۴

[۳] احکام القرآن للجصاص: ۳/۴۹۳

ان اللہ سبحانہ امر بالصلح قبل القتال و عین القتال عند البغی[1]

اللہ تعالیٰ نے قتال سے پہلے صلح کا حکم دیا اور قتال کو اس صورت کے ساتھ مخصوص کیا ہے جب کہ بغاوت اور سرکشی ہو

۷- ظالم اور باغی گروہ کے خلاف طاقت کا استعمال کون کرے اور کس حد تک کرے؟ یہ ایک اہم سوال ہے: اس کا جواب علامہ ابوبکر جصاص حنفی نے تفصیل سے دیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر باغی گروہ اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کے لیے تیار نہ ہوتو اس سے قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ بہ ظاہر اس میں قتال کی سب ہی صورتیں داخل ہیں۔ اگر اس کے لیے طاقت کا تھوڑا سا استعمال کافی ہو، جیسے لاٹھی چلانا یا جوتوں سے پٹائی کرنا تو زیادہ طاقت استعمال نہیں کی جائے گی، لیکن اگر اس سے وہ ظلم اور بغاوت سے باز نہ آئے تو تلوار بھی اٹھائی جائے گی۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس صورت میں بھی تلوار اٹھانا ناجائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے جو شخص منکر کو دیکھے وہ اسے طاقت سے بدل دے، اگر وہ اس کی طاقت نہ رکھتا ہوتو زبان سے اسے بدلے (اسے بدلنے کے لیے آواز اٹھائے) اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہوتو دل سے ناپسند کرے۔ یہ ایمان کا کم زور درجہ ہے۔ اس میں آپ نے طاقت کے ذریعہ منکر کے ازالہ کا حکم دیا ہے۔ بہ ظاہر اس کا تقاضا یہ ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو منکر کا ازالہ لازماً کیا جائے[2]

صحیح بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں حکومت اور معاشرہ کے درمیان فرق کرنا ہوگا۔ ظلم و زیادتی کو طاقت سے روکنا اصلاً حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اگر حکومت اپنی ذمہ داری محسوس نہ کرے تو معاشرہ کا فرض ہے کہ وہ اس کی طرف اسے توجہ دلائے اور ظلم کو مٹانے میں اس کے ساتھ تعاون کرے۔ جیسے مظلوم کے حق میں بے خوف و خطر شہادت دینا، اسے اخلاقی اور مالی مدد فراہم کرنا، ظالم کو کسی طرح کا تعاون نہ دینا، اس کا سماجی مقاطعہ کرنا، اس بات کی کوشش کرنا کہ اس کی تعزیر و تادیب ہو اور قرار واقعی اسے سزا ملے۔ اس طرح کے اور بھی اقدامات معاشرہ کرسکتا ہے، بلکہ اسے کرنا چاہیے۔ بعض ہنگامی حالات

---

[1] احکام القرآن لابن العربی: ۱۷۱۹/۴

[2] احکام القرآن للجصاص: ۴۹۱/۳

میں وہ مظلوم کی جان مال اور عزت و آبرو کو بچانے کے لیے قوت کا استعمال بھی کرسکتا ہے، لیکن اس معاملہ میں وہ ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا اس کے لیے صحیح نہ ہوگا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی باغی گروہ اسلامی حکومت ہی کے خلاف کھڑا ہوجائے۔ اس صورت میں معاشرہ کا فرض ہے کہ وہ بغاوت کے کچلنے میں حکومت کے ساتھ تعاون کرے۔

اس کا بھی امکان ہے کہ خود حکومت ظلم و جور کا رویہ اختیار کرے تو اس وقت اسے روکنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی، لیکن یہ بڑا نازک کام ہے۔ اس میں اس کا خیال رکھا جائے گا کہ ظلم کو روکنے میں کوئی بڑا فتنہ نہ پیدا ہو اور دوسرے مظالم کا دروازہ نہ کھل جائے۔ تفسیر کبیر میں یہی بات اس طرح کہی گئی ہے:

فقاتلوا التی تبغی ای الظالم یجب علیکم دفعه عنه ثم ان الظالم ان کان هو الرعیة فالواجب علی الامیر دفعهم و ان کان هو الامیر فالواجب علی المسلمین منعه بالنصیحة فما فوقها و شرطه ان لا یثیر فتنة مثل التی فی اقتتال الطائفتین او اشد منها[1]

تم جنگ کرو اس گروہ سے جو حد سے آگے بڑھے یعنی ظالم سے۔ تم پر ظالم کو مظلوم سے دفع کرنا واجب ہے۔ اب اگر ظالم کا تعلق رعایا سے ہے تو امیر پر واجب ہوگا کہ ظلم کرنے والوں کو دفع کرے لیکن اگر ظلم کا ارتکاب خود امیر سے ہو تو مسلمانوں پر واجب ہوگا کہ اسے نصیحت سے یا اس سے آگے کی کسی تدبیر سے ظلم سے روک دیں۔ لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اس طرح کا یا اس سے بڑا فتنہ نہ پیدا ہوجائے جیسے دو گروہوں کی جنگ سے پیدا ہوتا ہے۔

اس طرح اسلام، حکومت اور معاشرہ دونوں کو ظلم کے خلاف کھڑا کرتا اور دونوں

---

[1] تفسیر کبیر: جلد ۱۴ جزء ۲۸ ص ۱۰۹۔ کسی گروہ کے ظلم اور بغاوت کی بہت سی شکلیں ہوسکتی ہیں اور حالات بھی مختلف ہوسکتے ہیں۔ اس سے ان کے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔ یہاں ان سب سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ تفصیل کے لیے فقہ کی کتابیں دیکھی جائیں۔

کے تعاون سے ظلم کو ختم کرتا ہے۔ وہ حکومت کو ہدایت کرتا ہے کہ ظلم کو طاقت سے روکے اور معاشرہ کو حکم دیتا ہے کہ ظلم کے مٹانے میں حکومت کے ساتھ تعاون کرے اور اس بات کی نگرانی کرتی رہے کہ حکومت خود بھی عدل کے راستہ سے ہٹنے نہ پائے۔

ظالم اور مظلوم دونوں کی مدد کی جائے

اسلام معاشرہ کو ظلم سے پاک کرنا چاہتا ہے اس لیے وہ ظلم کے خلاف تو سخت فضا تیار کرتا ہے لیکن ظالم کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات نہیں بھڑکاتا، بلکہ اسے وہ ہم دردی اور خیر خواہی کا مستحق سمجھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ظالم اپنے غلط رویے سے، چاہے اسے اس کا شعور ہو یا نہ ہو، خود کو تباہ کرتا ہے۔ اس کی دنیا بھی برباد ہوتی ہے اور آخرت بھی۔ اسلام کو مظلوم کی تباہی گوارا ہے اور نہ ظالم کی۔ اسے دونوں کے ساتھ ہم دردی ہے اور وہ دونوں کو بچانا چاہتا ہے۔ لیکن اس ہم دردی کی نوعیت مختلف ہے۔ حدیث میں کہا گیا ہے کہ ظالم اور مظلوم دونوں ہی تمھاری مدد کے محتاج ہیں۔ مظلوم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظالم کی چیرہ دستی سے بچایا جائے اور ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے جور و ستم سے باز رکھا جائے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

انصر اخاک ظالما او مظلوما قالوا یا رسول اللہ ھٰذا ننصرہ مظلوما فکیف ننصرہ ظالما قال تأخذ فوق یدیہ [1]	اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم صحابہ نے عرض کیا، اگر وہ مظلوم ہوگا تو بلاشبہ ہم اس کی مدد کریں گے لیکن ظالم ہو تو کیسے مدد کریں؟ آپؐ نے فرمایا تم اس کا ہاتھ پکڑلو (اور اسے ظلم کرنے نہ دو۔ یہی اس کی مدد ہے)

آج کی جاہلیت کی طرح جاہلیت عرب میں بھی ہر معاملہ میں اپنے خاندان، قبیلہ، ذات اور برادری کو دیکھا جاتا اور حق و ناحق سے آنکھیں بند کر کے اس کی حمایت اور نصرت کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس بنیاد پر بڑی بڑی جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور خون خرابے سے عرب کا ریگستان سرخ ہوتا رہتا تھا۔ اسلام نے اس عصبیت جاہلیہ کو ختم کیا۔ اس نے

---

[1] بخاری، کتاب المظالم والقصاص، باب اعن اخاک ظالماً او مظلوماً۔

کہا قوم کے ساتھ اس میں شک نہیں کہ ہم دردی ہونی چاہیے لیکن اس ہم دردی کا تقاضا یہ ہے کہ اگر وہ ظلم و زیادتی کی روش اختیار کرے تو اسے آگے بڑھنے سے روک دیا جائے، نہ یہ کہ ہلاکت کے جس کھڈ میں وہ گر رہی ہے اس میں آدمی خود بھی کود پڑے۔

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ دو نوجوان، جن میں سے ایک مہاجر اور دوسرا انصاری تھا، آپس میں لڑ پڑے۔ انصاری نوجوان نے انصار کو مدد کے لیے پکارا اور مہاجرین سے تعلق رکھنے والے نوجوان نے مہاجرین کو آواز دی۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سنا تو باہر تشریف لائے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ دو نوجوانوں کا جھگڑا تھا، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اس پر آپ نے اطمینان کا اظہار فرمایا کہ کوئی بڑا حادثہ نہیں پیش آیا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ نوجوانوں کی اس پکار کو سن کر آپؐ نے فرمایا۔

دعوھا فانھا مُنتِنَةٌ

اسے ختم کرو یہ تو بڑی گندی پکار ہے۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا۔

و لینصر الرجل اخاہ ظالما او مظلوما ان کان ظالما فلینھہ فانہ لہ نصر و ان کان مظلوما فلینصرہ[1]

آدمی کو اپنے بھائی کی مدد کرنی چاہیے۔ خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اگر ظالم ہو تو اسے ظلم سے باز رکھے۔ یہی اس کی مدد ہے اور مظلوم ہو تو (ظالم کے مقابلہ میں اس کی حمایت کرے۔)

کسی فرد یا گروہ کی مظلومی پر ایک مسلمان کو جو تکلیف ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے اور جس خلوص اور ہم دردی سے وہ اس کا مداوا چاہتا ہے، ظالم سے بھی اسے اتنی ہی ہم دردی ہونی چاہیے۔ اسے تباہی سے بچانے کے لیے بھی اس کے اندر وہی دل سوزی، دردمندی اور تڑپ پائی جانی چاہیے جو مظلوم کے حق میں اس کے اندر پائی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مظلوم کی صرف دنیا خراب ہوتی ہے اور ظالم کی دنیا ہی نہیں آخرت بھی برباد ہوتی ہے، یہ بہت بڑی بربادی ہے۔ اس پہلو سے تو مظلوم سے زیادہ ظالم ہم دردی کا مستحق ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب نصر الاخ ظالماً او مظلوماً

مظلوم کے حقوق

کسی شخص پر ظلم و زیادتی ہو تو اسے یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ اس کے خلاف آواز اٹھائے اور اس نقصان کی تلافی کا مطالبہ کرے جو اسے پہنچا ہے، ورنہ معاشرہ میں کم زوروں کے حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے۔ جس کسی کے ہاتھ میں طاقت ہوگی وہ جب چاہے گا ان کے حقوق پر دست درازی کر گزرے گا اور اسے کسی جوابی اقدام کا خطرہ نہ ہوگا۔ اسلام نے مظلوم کو وہ سارے حقوق دیے ہیں جن کے ذریعہ وہ ظلم کا مقابلہ کرسکتا، ظالم کو بے نقاب کرسکتا اور اس کے خلاف چارہ جوئی کرسکتا ہے۔ یہاں اس سلسلہ کے بعض حقوق کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

مظلوم ظلم کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے

اگر کسی پر ظلم و ستم ہو تو اسے ظالم کے خلاف آواز اٹھانے کا فطری حق ہے۔ لیکن معاشرہ کے کم زور افراد اور طبقات بالعموم اس حق سے محروم ہی رہے ہیں۔ انھیں اس قدر دبایا اور کچلا گیا کہ وہ بڑے سے بڑے ظلم اور بربریت کے خلاف بھی دم مارنے کی ہمت نہیں پاتے تھے۔ وہ اپنے حقوق کے مالک نہ تھے، بلکہ ان کے حقوق ان جابروں اور ظالموں کے ہاتھوں میں تھے جو لطف و محبت اور ہم دردی سے نا آشنا تھے۔ وہ جب چاہتے ان بے نواؤں کے حقوق روندتے اور پامال کرتے اور انھیں حرف شکایت تک زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی۔ اسلام نے مظلوم کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق دیا اور اعلان کیا:

لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا۝ (النساء:۱۴۸)

اللہ کو پسند نہیں کہ کسی کی بری بات کا ذکر کیا جائے۔ لیکن جس شخص پر ظلم ہو (وہ اس کا اظہار کرسکتا ہے) اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

کسی غلط اور گندی بات کا زبان سے نکالنا اور اس کا چرچا کرنا سخت ناپسندیدہ ہے، اس لیے کہ اس سے اسے فروغ ملتا ہے۔ جو گندگی ایک جگہ ہوتی ہے وہ دس جگہ پھیلتی ہے، البتہ کسی پر ظلم ہو تو اسے اس کے اظہار و اعلان کا حق ہے۔ اس سے ایک طرف ظالم بے نقاب ہوگا اور سوسائٹی اس کے شر سے محفوظ رہے گی تو دوسری طرف مظلوم کے ساتھ ہم دردی پیدا ہوگی اور اس پر ہونے والے ظلم و ناانصافی کا مداوا ہوگا۔

ظلم و زیادتی اور بدسلوکی کی بہت سی شکلیں ہوسکتی ہیں۔ آدمی کے ساتھ جس قسم کی بھی زیادتی ہو کیا وہ اس کا اظہار کرسکتا ہے یا بعض مخصوص زیادتیوں ہی کے اظہار کی اسے اجازت ہے؟ مشہور تابعی حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ اگر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا مہمان بنے اور وہ اس کی ٹھیک سے مہمانی نہ کرے تو وہ اس کی شکایت کرسکتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں سے ایک حقِ ضیف بھی ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ ایک مسلمان کسی اجنبی جگہ پہنچ جائے تو بھوکا پیاسا رہنے پر مجبور نہ ہو۔ وہاں وہ اپنے کسی بھی مسلمان بھائی کا مہمان بن سکتا ہے۔ حقِ ضیف کے سلسلہ میں واضح روایات بھی موجود ہیں جن کی بنیاد پر امام احمدؒ وغیرہ نے اسے واجب کہا ہے۔[1]

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: آیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی پر زیادتی ہو تو وہ بد دعا کرسکتا ہے۔ یہ درحقیقت مثالیں ہیں جن کے ذریعہ آیت کے مفہوم کو سمجھایا گیا ہے۔ ورنہ آیت میں مظلوم کو بغیر کسی تخصیص کے اپنے اوپر ہونے والے ہر ظلم کے اظہار کی بلکہ انتقام کی اجازت دی گئی ہے۔ چناں چہ سدّی کہتے ہیں:

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۷۱

ان اللہ لا یحب الجھر بالسوء من احد من الخلق و لکن یقول من ظلم فانتصر بنیل ما ظلم فلیس علیہ جناح.

بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ کوئی بھی شخص برائی کا اظہار کرے، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس پر ظلم ہوا ہے وہ اگر اپنے ظلم کے جواب میں انتقام لے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

علامہ ابن جریر طبری نے ان سب اقوال کو نقل کرنے کے بعد آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے: ''اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ علانیہ کسی کی برائی کی جائے، البتہ جس شخص پر ظلم ہوا ہے وہ اگر اس کا ذکر کرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کسی نے مہمان کا حق بالکل نہیں ادا کیا یا ٹھیک سے نہیں ادا کیا یا کسی کی جان و مال پر اس نے زیادتی کی۔ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ مظلوم اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ وہ اس کی مدد کرے۔ اگر وہ آواز کے ساتھ دعا کرے تو یہ بھی ایک طرح کا اظہار ہی ہے۔''[1]

مفسر خازن لکھتے ہیں: ''علماء نے کہا ہے کہ لوگوں کے خفیہ حالات کو دوسروں پر ظاہر کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے لوگ غیبت میں مبتلا ہوتے ہیں اور خود وہ شخص شک وشبہ میں گرفتار ہوتا ہے۔ البتہ جس پر ظلم ہوا ہے وہ اس کا اظہار کرسکتا ہے۔ اس طرح کہ فلاں نے اس کا مال چرایا یا غصب کیا ہے۔ اگر کوئی اسے برا بھلا کہے تو اس کا جواب دینے کا بھی اسے حق ہے۔''[2]

جس شخص پر ظلم و زیادتی ہو اس پر یہ مزید ظلم ہوگا کہ اسے اس کے اظہار کی بھی اجازت نہ دی جائے۔ مظلوم کی زباں بند کرنے سے ظلم بے قید ہوجاتا ہے اور اسے پھلنے پھولنے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ مظلوم کو یہ حق دے کر کہ وہ ظلم کا برملا

---

[1] تفسیر ابن جریر: جزء ۶/۲-۴

[2] تفسیر الخازن مع تفسیر البغوی: ۲/۱۸۴-۱۸۵ امام رازی نے اس تشریح کو اصم کی طرف منسوب کیا ہے۔ ملاحظہ ہو التفسیر الکبیر: جلد ۶ جزء ۱۱ ص ۷۲

اظہار کرسکتا ہے اسلام نے معاشرہ کو اس کے ساتھ ہم دردی کی ترغیب دی ہے۔ اسلام ہر پہلو سے ظلم کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

حق دار حق کا مطالبہ کرسکتا ہے

احادیث میں یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ حق دار اپنے حق کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اسے اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ کسی کی کم زوری سے فائدہ اٹھانا اور اُسے اپنے حق کے مطالبے سے باز رکھنے کی کوشش کرنا غیر اسلامی رویہ ہے۔ حق دار کی طرف سے اپنے حق کے مطالبے میں شدت اور سختی کا مظاہرہ بھی ہو تو اسے برداشت کیا جانا چاہیے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے (جو غالبًا کافر تھا) اونٹ قرض لیا۔ اس نے شدت سے واپسیِ قرض کا مطالبہ کیا تو صحابہ کرامؓ نے اسے سخت جواب دینا چاہا۔ آپؐ نے فرمایا:

دعوه فان لصاحب الحق مقالا — اسے چھوڑ دو اس لیے کہ جو حق دار ہے اسے بولنے کی گنجائش ہے۔

اس کے بعد حکم دیا کہ ایک اونٹ خرید کر اسے دے دیا جائے۔ صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ جو اونٹ اس سے لیا گیا تھا اس سن وسال کا اونٹ تو اس وقت دست یاب نہیں ہے، البتہ اس سے بہتر اونٹ موجود ہے۔ آپ نے فرمایا وہی اونٹ خرید کر اسے دے دو۔ تم میں بہتر انسان وہ ہے جو بہتر طریقہ سے قرض کی ادا یگی کرے۔[1]

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

ای صولة الطلب و قوة الحجة لٰكن مع مراعاة الادب المشروع[2] — وہ زور سے طلب کرسکتا اور دلیل کی قوت سے بول سکتا ہے لیکن شریعت نے جو ادب بتایا ہے اس کی رعایت کرتے ہوئے۔

---

[1] بخاری، کتاب الاستقراض، باب استقراض الابل۔ مسلم: کتاب المساقاۃ۔

[2] فتح الباری: ۳۶/۵

مطلب یہ کہ شریعت کے قائم کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے حق دار پورے زور اور قوت سے اپنے حق کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اسی حدیث کے ذیل میں علامہ ابن الملک کہتے ہیں کہ حق دار کو اپنا حق نہ ملے تو صرف یہی نہیں کہ شکایت اور ڈانٹ ڈپٹ کی اسے اجازت ہوگی بلکہ وہ قانونی چارہ جوئی بھی کرسکتا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

المراد بالحق هنا الدين يعنى من كان علىٰ غريمه حق فماطله فله ان يشكوه و يرافعه الى الحاكم و يعاتب عليه و هو المراد بالمقال [1]

یہاں حق سے مراد قرض ہے۔ یعنی جس کا اپنے قرض دار پر حق ہو اور وہ اس کے ساتھ ٹال مٹول کرے تو وہ اس کی شکایت کرسکتا ہے، حاکم تک اسے لے جاسکتا ہے اور اس کی ڈانٹ ڈپٹ بھی کرسکتا ہے۔ حدیث میں جو 'مقال' کا لفظ آیا ہے اس کا یہی مطلب ہے۔

حق کے ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے

ایک انسان دوسرے انسان کا حق ادا کرنے میں غفلت اور کوتاہی کرے یا حق دار اپنے جائز حق سے زیادہ کا مطالبہ کرے تو ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس پر اگر بندش نہ لگائی جائے تو ظلم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوسکتا ہے۔ اسلام اس رویہ کو غلط اور ناجائز ٹھہراتا اور اسے سختی سے روکتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

مطل الغنى ظلم فاذا اتبع احدكم على مَلِيٍّ فليتبع [2]

مال دار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے (اس کی ایک مسلمان سے توقع نہیں کی جاسکتی اس لیے) جب تم میں سے کسی کو کسی مال دار کے پیچھے بھیجا جائے (قرض کے سلسلہ میں اس کا حوالہ دیا جائے) تو وہ اس کے پیچھے جائے (حوالہ قبول کرے)

---

[1] مبارق الازہار شرح مشارق الانوار: ۱/ ۱۴۷

[2] بخاری: کتاب الاجارہ، باب الحوالہ الخ۔ مسلم: کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب تحریم مطل الغنی

حدیث میں 'مطل' کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی حق کی ادائگی میں لیت ولعل اور تاخیر کے ہیں۔ امام نووی قاضی عیاض وغیرہ کے حوالہ سے کہتے ہیں:

المطل منع قضاء ما استحق اداؤہ[1]	جس حق کا ادا کرنا ضروری ہوجائے اس کے ادا کرنے سے انکار کرنا۔

حافظ ابن حجر نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

تأخیر ما استحق اداؤہ بغیر عذر[2]	جس چیز کا ادا کرنا ضروری ہوجائے اس کے ادا کرنے میں بغیر کسی عذر کے تاخیر کرنا۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص صاحب حیثیت ہے، اس کے لیے حقوق کی ادائی میں تاخیر ناروا ہے، اس لیے کہ اس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہوسکتی۔ حق کا ادا نہ کرنا ہی ظلم نہیں ہے، بلکہ بلا وجہ اس میں حیلے حوالے کرنا بھی ظلم ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں:

اس حدیث کی رو سے کسی غنی اور تونگر شخص کا حق دار کو حق ادا نہ کرنا ظلم اور حرام ہے۔[3]

حق کے ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنے والا فاسق ہے

جو شخص بغیر کسی عذر کے قرض یا کسی بھی حق کے ادا کرنے میں دانستہ تاخیر کرے، علماء نے اسے فاسق کہا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں:

"امام مالک کے تلامذہ اور دوسرے اہلِ علم کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک مرتبہ بھی قرض کی ادائگی میں ٹال مٹول کرے، تو کیا اسے فاسق سمجھا جائے گا اور کسی معاملہ میں وہ شہادت دے تو قبول نہیں کی جائے گی یا اسے

---

[1] شرح مسلم: جلد۵، جزء:۱۰، ص۱۹۲

[2] فتح الباری: ۳۱۲/۴

[3] شرح مسلم، حوالہ سابق، ص۱۹۲

اس وقت فاسق سمجھا جائے گا جب کہ بار بار اس سے یہ حرکت سرزد ہو۔ شوافع کے مسلک کا تقاضا یہ ہے کہ دوسری صورت ہی میں اسے فاسق قرار دیا جائے۔"[1]

لیکن علامہ سبکی کہتے ہیں: شوافع کے مسلک کا تقاضا بالکل دوسرا ہے۔ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایسے شخص کو فاسق قرار دیا جائے اور اس کی شہادت قبول نہ کی جائے۔ اس کی دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ مطالبہ کے باوجود کسی حق کا ادا نہ کرنا غصب ہے اور غصب گناہ کبیرہ ہے۔ پھر یہ کہ اسے حدیث میں ظلم کہا گیا ہے۔ یہ خود بھی اس کے گناہِ کبیرہ ہونے کی دلیل ہے۔ گناہ کبیرہ کے بارے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ کسی سے بار بار سرزد ہو تب ہی اسے فاسق قرار دیا جائے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کے فاسق ہونے کا فیصلہ اس وقت کیا جائے گا جب کہ یہ صاف اور صریح طور پر معلوم ہو کہ وہ بغیر کسی عذر کے ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔"[2]

ایک سوال یہ بھی ہے کہ حق کے محض واجب ہوجانے کے بعد اس کا ادا نہ کرنا فسق ہے یا اس کے لیے مطالبہ ضروری ہے؟ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "علماء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے، لیکن حدیث میں 'مطل' کا لفظ آیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ حق کا نہ ادا کرنا، فسق نہیں ہے بلکہ مطالبہ کے بعد بھی اس کا نہ ادا کرنا فسق ہے۔"[3]

حق کے نہ ادا کرنے پر سزا دی جاسکتی ہے

کسی کا حقِ واجب قصداً ادا نہ کرنا اور اس میں ٹال مٹول کرنا صریح ظلم ہے۔ اس کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی جاسکتی ہے۔ چناں چہ حافظ ابن حجر اسی حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں:

---

[1] شرح مسلم حوالہ سابق
[2] ابن حجر، فتح الباری: ۳۱۳/۴
[3] فتح الباری: ۳۱۳/۴

واستدل به علی ملازمة المماطل والزامه بدفع الدین والتوصل الیه بکل طریق واخذه منه قهرا[1]

اس سے ٹال مٹول کرنے والے کو پکڑے رہنے، قرض کی ادائیگی کو اس کے لیے ضروری قرار دینے، ہر ممکن تدبیر سے اس مقصد تک پہنچنے اور زبردستی اس سے قرض واپس لینے پر استدلال کیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں یہی بات صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ چناں چہ عمرو بن شریدؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لیُّ الواجد یُحِلُّ عرضَه و عقوبته[2]

جس کے پاس پیسہ موجود ہے وہ حق کی ادائیگی سے منہ موڑتا ہے تو اس بات کو جائز قرار دیتا ہے کہ اس کی عزت کا خیال نہ کیا جائے اور اسے سزا دی جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص استطاعت کے باوجود حق دار کا حق ادا نہ کرے اور اسے مار کھانے کی کوشش کرے تو اس کے ظلم و زیادتی کو دنیا کے سامنے کھولنا جائز ہوگا۔ اس سے اگر سوسائٹی میں اس کا وقار مجروح ہو رہا ہے اور اس کی جھوٹی عزت پر حرف آرہا ہے تو اس میں کسی دوسرے کا قصور نہیں ہے، وہ خود اس نے اپنی عزت کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ یہی نہیں، ریاست کو اس کے خلاف تعزیری کارروائی کا بھی حق ہے۔ وہ اسے مناسب سزا دے سکتی ہے۔ چناں چہ حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

یحل عرضَهُ یغلظُ له و عقوبته یُحبَسُ له[3]

وہ اپنی عزت کو حلال کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کی جائے گی اور اس کی سزا سے مراد یہ ہے کہ اسے قید کیا جائے گا۔

---

[1] حوالہ سابق

[2] ابو داؤد: کتاب القضاء، باب فی الدین ھل یحبس له۔ نسائی: کتاب البیوع باب مطل الغنی

[3] ابو داؤد: حوالۂ سابق

علامہ شوکانی کہتے ہیں: ''اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جو شخص قرض ادا کرسکتا ہو اور ادا نہ کرے اسے تادیب کے طور پر اور اس پر سختی کرنے کے لیے قید کیا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ قرض ادا کردے۔''[1]

نادار کا حکم

ان احادیث کی بنا پر کہا گیا ہے کہ کسی نادار شخص کی طرف سے حق کے ادا کرنے میں تاخیر ہو تو اسے ظلم نہیں کہا جائے گا۔ چناں چہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت گزر چکی ہے، جس میں مال دار کے ٹال مٹول کو ظلم کہا گیا ہے۔ اس کے ذیل میں امام نووی لکھتے ہیں:

''اس سے از خود یہ بات نکلتی ہے کہ اگر کوئی غریب اور نادار کسی کا حق نہیں ادا کرپا رہا ہے تو اسے ظلم یا حرام نہیں کہا جائے گا۔ اس لیے کہ وہ معذور ہے۔ اسی طرح ایک صاحبِ حیثیت اس لیے تاخیر کر رہا ہے کہ بر وقت اس کے پاس رقم نہیں ہے یا اور کوئی (معقول) وجہ ہے تو اس کی تاخیر بھی جائز ہوگی۔''[2]

یہ بات حدیث سے 'مفہوم مخالف' کے طور پر اخذ کی گئی ہے۔ بعض لوگ اس کے قائل نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ''انھوں نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ جو شخص قرض ادا نہ کرسکے اسے ٹال مٹول کرنے والا کہا ہی نہیں جائے گا۔ اگر کوئی مال دار شخص بروقت مال نہ ہونے کی وجہ سے کوئی حق ادا نہیں کر پا رہا ہے تو وہ بھی ظلم کا ارتکاب نہیں کر رہا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایسے شخص کو زکوٰۃ میں فقراء کا جو حصہ ہے اس میں سے دیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ غنی کے حکم میں ہو تو اسے زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔''[3]

---

[1] نیل الاوطار: ۳۶۱/۵

[2] شرح مسلم: جزء:۱۰، ص ۱۹۲

[3] فتح الباری: ۳۱۳/۴

اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کا 'مفہوم مخالف' نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث میں جو وعید آئی ہے وہ غنی کے لیے ہے۔ جو غنی نہیں ہے اس کے لیے یہ وعید نہیں ہے۔ غالباً اسی وجہ سے امام نووی فرماتے ہیں: ''غنی وہ شخص ہے جو حق واجب بروقت ادا کرسکتا ہو۔ جو اس حیثیت میں نہیں ہے اسے غنی نہیں کہا جائے گا۔''[1]

ان احادیث سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ جو شخص نادار اور مفلس ہے اسے قرض کے نہ ادا کرنے پر گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس حدیث سے امام مالک، امام شافعی اور جمہور کے اس مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ جو شخص مفلس اور نادار ہے اسے قرض کے سلسلہ میں پکڑنا، قید کرنا اور اس سے زبردستی تقاضا کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ ادا کرنے کی حیثیت میں نہ ہو۔''[2]

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ''امام شافعی کی دلیل یہ ہے کہ کسی نادار سے مواخذہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ظالم ہے، حالاں کہ بہ ظاہر، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظالم نہیں ہے، اس لیے کہ وہ مجبور ہے۔ لیکن بعض علماء کے نزدیک قرض دار کو قید کیا جاسکتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ قرض خواہ اسے اپنے قبضے میں بھی رکھ سکتا ہے۔''[3]

فقہاء احناف کے نزدیک مالی حقوق کی دو قسمیں ہیں۔ بعض حقوق وہ ہیں کہ اگر حاکم کے پاس ثابت ہوجائیں اور مدعی اس بات کا مطالبہ کرے کہ مدعیٰ علیہ کو قید کی سزا دی جائے تو حاکم پہلے مدعیٰ علیہ سے کہے گا کہ وہ حق ادا کردے۔ اگر وہ ادا نہ کرے تو اسے قید کردے گا۔ جیسے کوئی شخص کسی سے کوئی چیز خریدے اور قیمت نہ ادا کرے یا عورت کا مہر (معجّل) نہ دے یا کسی کی مالی ضمانت لے اور اسے پورا نہ کرے۔ لیکن

---

[1] شرح مسلم جلد۵، جزء۱۰، ص۱۹۲

[2] شرح مسلم حوالہ سابق

[3] فتح الباری: ۴/۳۱۳

بعض حقوق وہ ہیں کہ اگر مدعیٰ علیہ یہ کہے کہ وہ نادار ہے اور حق ادا نہیں کرسکتا تو اسے اسی وقت قید کیا جائے گا جب کہ مدعی یہ ثابت کردے کہ وہ حق ادا کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جو صورتیں پہلے بیان ہوئی ہیں ان میں آدمی کا صاحبِ حیثیت ہونا از خود ظاہر ہے۔ اس لیے کہ خریدی ہوئی چیز اس کے پاس موجود ہے اسی سے اس کا غنی ہونا ثابت ہے۔ مہر اور کفالت کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے خود سے اسے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے ادا بھی کرسکتا ہے۔ اسی میں قرض اور اجرت بھی داخل ہے[1]

کسی بھی حق کے ادا کرنے میں ٹال مٹول صحیح نہیں ہے

جس طرح قرض کے ادا کرنے میں حیلے بہانے اور ٹال مٹول کرنا ظلم ہے اسی طرح وہ سارے حقوق جو ایک شخص کے دوسرے پر واجب ہوں ان کے پورا کرنے میں لیت و لعل اور بلا وجہ تاخیر کرنا بھی ظلم ہی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

و یدخل فی المطل کل من لزمہ حق کالزوج لزوجتہ والسید لعبدہ والحاکم لرعیتہ و بالعکس[2]	مطل' (جس سے منع کیا گیا ہے اس کے حکم) میں ہر وہ شخص داخل ہے جس پر کوئی حق لازم آئے۔ جیسے شوہر پر بیوی کا، آقا پر غلام کا اور حاکم پر رعیت کا حق ہے۔ اس کے برعکس بھی یہی حکم ہے۔

قرض دار حوالہ قبول کرے

جو شخص مال دار ہے اور قرض ادا کرسکتا ہے، حدیث میں جہاں اسے قرض کی ادائگی میں تاخیر نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہیں قرض خواہ کو ہدایت کی گئی ہے کہ قرض کے سلسلہ میں کسی صاحب حیثیت کا حوالہ دیا جائے تو اسے قبول کرلے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ہدایہ: ۳/۱۳۶-۱۳۷۔ رد المحتار مع در المختار: ۳/۴۳۸-۴۳۹

[2] فتح الباری: ۴/۳۳

و اذا اتبع احدکم علی ملی فلیتبع

اگر تم میں سے کسی کو (قرض کے سلسلے میں) کسی مال دار کا حوالہ دیا جائے تو اسے اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

"امام نوویؒ فرماتے ہیں: "اگر قرض دار حوالہ دے کہ فلاں شخص سے قرض وصول کرلیا جائے تو جمہور کے نزدیک اس کا قبول کرنا مستحب اور پسندیدہ ہے۔ بعض لوگوں نے اسے صرف مباح قرار دیا ہے۔ داؤد ظاہری وغیرہ نے اسے واجب کہا ہے۔"[۱]

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "جمہور نے اسے مستحب قرار دیا ہے۔ ایک شاذ رائے یہ ہے کہ وہ مباح ہے۔ حنابلہ میں سے اکثر نے اور ابوثورؒ، ابن جریرؒ اور اہل ظاہر نے اسے واجب کہا ہے۔"[۲]

فقہ حنفی کی رو سے حوالہ اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ قرض دار، قرض خواہ اور جس کا حوالہ دیا جارہا ہے تینوں کی رضا مندی اس میں شامل ہو۔[۳]

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک قرض خواہ کی رضا مندی تو ضروری ہے لیکن جس کا حوالہ دیا جارہا ہے امام مالکؒ فرماتے ہیں اس کی رضا مندی ضروری نہیں ہے، الاّ یہ کہ قرض خواہ کی اس سے کوئی عداوت اور دشمنی ہو۔ ایک روایت کے مطابق امام شافعیؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ ایک دوسری روایت یہ ہے کہ جس کا حوالہ دیا جارہا ہے اس کی رضا مندی ضروری ہے۔ فقہ حنبلی میں ہے کہ جس کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اگر مالی لحاظ سے اس حیثیت میں ہے کہ رقم ادا کرسکتا ہے اور انکار اور ٹال مٹول کرنے والا نہیں ہے تو قرض خواہ کو لازماً حوالہ قبول کرنا ہوگا۔ اس صورت میں قرض خواہ کی اور جس کا حوالہ دیا جارہا ہے رضا مندی ضروری نہیں ہے۔[۴]

۱۔ شرح مسلم: جلد۵، جزء:۱۰، ص ۱۹۳
۲۔ فتح الباری: ۴/۳۱۲
۳۔ ہدایہ: ۳/۱۲۹
۴۔ المغنی: ۴/۸۳

اگر قرض خواہ نے حوالہ قبول کرلیا اور یہ شرط نہیں رکھی کہ جس کا حوالہ دیا گیا ہے اسے صاحب حیثیت ہونا چاہیے تو اب وہ امام لیثؒ، امام شافعیؒ، ابو عبیدؒ اور ابن المنذرؒ وغیرہ کی رائے میں حوالہ دینے والے کی طرف قرض کے سلسلہ میں رجوع نہیں کرسکتا۔ چاہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے وہ ٹال مٹول کرے یا اس کے افلاس، موت یا اور کسی وجہ سے وہ اس سے قرض وصول نہ کرسکے۔

امام احمدؒ سے جو روایات پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کا حوالہ دیا گیا وہ مفلس تھا اور قرض خواہ اس سے واقف نہیں تھا تو اسے حوالہ دینے والے کی طرف رجوع کا حق ہوگا۔ وہ چاہے تو اس کے افلاس کے باوجود اس حوالہ کو قبول بھی کرسکتا ہے۔یہی رائے حنابلہ میں سے ایک جماعت کی ہے۔ امام مالکؒ سے بھی اسی طرح کا ایک قول منقول ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جس شخص کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا مفلس ہونا ایک کم زوری ہے۔ اس وجہ سے قرض دار کو اس کا حق ہے کہ اس حوالہ کو رد کردے۔ قاضی شریحؒ اور امام نخعیؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اگر مفلس ہوجائے یا انتقال کرجائے تو جس نے حوالہ دیا ہے اس کی طرف رجوع کا حق ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں: قرض خواہ دو حالتوں میں حوالہ دینے والے کی طرف رجوع کرسکتا ہے۔ ایک یہ کہ جس کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا افلاس کی حالت میں انتقال ہوجائے۔ دوسری صورت یہ کہ وہ حاکم کے سامنے قسم کھا کر اس حوالہ ہی سے انکار کردے اور حوالہ دینے اور قبول کرنے والے کے پاس کوئی شہادت نہ ہو۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں کے علاوہ وہ اس وقت بھی رجوع کرسکتا ہے جب کہ حاکم اس شخص کے افلاس کا فیصلہ کردے جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔[1]

حوالہ کے موضوع پر ہمارے فقہاء نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہاں بعض موٹی موٹی اور ضروری باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ حدیث کا اصل منشا یہ ہے کہ قرض دار کی

---

[1] المغنی: ۴/۵۸۱- ہدایہ: ۳/۱۲۹-۱۳۰

طرف سے قرض خواہ کو اپنا قرض وصول کرنے کی کوئی معقول صورت تجویز کی جائے تو اسے قبول کرلینا چاہیے ـــــ کسی صاحب حیثیت آدمی کا حوالہ بھی اسی طرح کی ایک صورت ہے۔ خواہ مخواہ کسی ایسی صورت پر اسے اصرار نہیں کرنا چاہیے جس سے قرض دار زحمت اور دشواری محسوس کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرض دار کے اندر اگر قرض کے ادا کرنے کا اور قرض خواہ کے اندر اسے پریشان نہ کرنے کا جذبہ موجود ہو تو قرض کی وجہ سے بعض اوقات معاملات میں جو الجھنیں پیدا ہوجاتی ہیں وہ از خود ختم ہوتی چلی جائیں گی اور قرض تعلقات کی خرابی کا سبب نہیں بن جائے گا۔

انتقام کا حق اور عفو و درگزر کی فضیلت

انسانی فطرت اور جذبۂ انتقام

اگر کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی ہو اور اس کے حقوق پر دست درازی کی جائے تو اس کے اندر فطری طور پر غم و غصہ اور انتقام کا جذبہ ابھر آتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے اس کا بدلہ لے اور جس نے اسے نقصان پہنچایا ہے اسے وہ بھی نقصان پہنچائے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک حیوانی جذبہ ہے۔ اسے دبایا جانا چاہیے۔ ورنہ انسان کی انسانیت مجروح ہوگی اور وہ درندہ صفت بن جائے گا، لیکن اس جذبہ کو حیوانی یا غیر انسانی جذبہ کہہ کر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ یہ انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اگر کسی دباؤ اور مجبوری کی وجہ سے وہ انتقام نہ لے سکے تو اس پر شدید ردعمل ہوتا ہے۔ اس کے اندر عداوت، نفرت اور بغض و حسد جیسے جذبات پرورش پانے لگتے ہیں۔ اور احساس کم تری اسے سخت نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا کردیتا ہے۔ پھر جب موقع ملتا ہے تو وہ اپنی آتشِ انتقام کو بجھانے کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو بہ حیثیت انسان اسے نہیں کرنا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ حیوان کے اندر بھی جذبۂ انتقام موجود ہے۔ لیکن ہر وہ جذبہ جو انسان کے ساتھ حیوان میں بھی پایا جائے غلط اور قابل نفرت نہیں ہے۔ بھوک،

پیاس اور جنسی خواہش انسان اور حیوان دونوں میں ہے۔ دونوں ان کی تکمیل پر اپنے ذاتی اور نوعی بقا کے لیے مجبور ہیں۔ انسان کے لیے ان میں سے کسی بھی خواہش کی تکمیل کو اس بنا پر غلط یا ناپسندیدہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حیوان میں بھی پائی جاتی ہے۔ البتہ انسان اور حیوان کا فرق یہ ہے کہ حیوان اپنے جذبات کی تسکین محض اپنی طبیعت کے تقاضے کے تحت کرتا ہے اور انسان اس میں اخلاق اور قانون کا پابند ہوتا ہے۔

غصہ اور انتقام کے جذبہ کا پایا جانا انسان کی بقا اور تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ اس سے وہ اپنے اوپر ہونے والے جور و ظلم کو روکتا اور اپنے حقوق کا دفاع اور ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اس جذبہ کی کمی انسان کو بعض اوقات بے حسی اور بے غیرتی میں مبتلا کردیتی ہے اور وہ ظلم سے شکست کھانے اور اس کے مقابلہ میں سپر ڈالنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ یہ جذبہ اگر بالکل ہی سرد پڑ جائے تو ہر جابر و ظالم اسے بہ آسانی ظلم کا ہدف بنا سکتا اور اس کے حقوق سلب کرسکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ظلم کا انتقام لے کر انسان نفسیاتی سکون محسوس کرتا ہے۔ اس سکون کے حاصل کرنے کا اسے فطری حق ہے۔ قانون کی ضرورت اور اہمیت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ وہ بھی ایک پہلو سے یہ مقصد پورا کرتا ہے۔ اس لیے کہ قانون جب ظالم کو اس کے ظلم کی سزا دیتا ہے تو جہاں ایک سماجی فرض انجام دیتا ہے وہیں مظلوم کے جذبۂ انتقام کو ایک طرح سے تسکین بھی فراہم کرتا ہے۔ ظاہر ہے، قانون کی حکم رانی کو اس لیے غلط نہیں کہا جاسکتا اور لاقانونیت کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ اس سے مظلوم کے جذبۂ انتقام کو راحت ملتی ہے۔

جذبۂ انتقام۔ اسلام کی نظر میں

اسلام جذبۂ انتقام کو ایک فطری جذبہ کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے اور مظلوم کو ظالم سے بدلہ لینے کی اجازت دیتا ہے۔ اس نے اللہ کے نیک بندوں کی ایک صفت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْىُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ○ اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ (الشوریٰ:۳۹)

سوال یہ ہے کہ کیا کسی سے انتقام لینا قابل تعریف ہے کہ اللہ والوں کی صفات کے ذیل میں اس کا ذکر کیا جائے؟ علامہ ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں: ''اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ظالم کو راہ حق پر قائم رکھنا اور جس سزا کا وہ مستحق ہے اسے وہ سزا دینا دراصل اسے ٹھیک کرنا ہے۔ اس کی ستائش اور تعریف ہی کی جائے گی۔''[1]

حافظ ابن کثیرؒ آیت کا مطلب اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ''جو شخص ظلم و زیادتی کرے، اللہ کے نیک بندوں میں ان سے انتقام لینے کی قوت ہے۔ وہ بے بس اور عاجز نہیں ہیں کہ انتقام نہ لے سکیں، بلکہ اس کی قوت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔''[2]

علامہ ابو السعودؒ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر (خودی کا) ایسا جذبہ رکھا ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے جھکنے اور ذلیل ہونے سے نفرت کرتے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کرے تو وہ اس سے انتقام لیتے ہیں۔ یہ دراصل دوسری بڑی بڑی خوبیوں کے ساتھ ان کی شجاعت اور بہادری کا ذکر ہے۔''[3]

اسی وجہ سے حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: ''سلف اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ اہل ایمان اس طرح ذلیل اور پست ہوکر رہیں کہ اللہ کے نافرمانوں اور فاسقوں کے حوصلے بڑھ جائیں اور وہ ان پر زیادتی کرنے لگیں۔ البتہ جب ان کو طاقت ملتی ہے تو وہ معاف کردیتے ہیں۔''[4]

انتقام میں زیادتی کی ممانعت

بعض اوقات ظلم و زیادتی کے خلاف اتنا شدید جذبہ ابھرتا ہے کہ انتقام کی آگ بجھانے کے لیے انسان سارے اخلاقی اور قانونی حدود توڑ پھینکتا ہے۔ اس کے بڑے ہی

---

[1] تفسیر ابن جریر: پارہ ۲۵/۲۴ [2] تفسیر ابن کثیر: ۱۱۸/۴ [3] تفسیر ابو السعود: ۲۶۹/۷
[4] بخاری: کتاب المظالم، باب الانتصار من الظالم۔ جصاص، احکام القرآن: ۴۷۵/۳

خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں اور نکلتے رہے ہیں۔ جب کبھی اس پر بندش نہیں عائد کی گئی، مظلوم نے ظالم کی جگہ لے لی اور ظلم کی روایات تازہ کرنی شروع کردیں۔ غصہ، نفرت اور انتقام کی ایک نئی لہر اٹھی اور مظلوم نے ظالم بن کر وہ سب کچھ کیا جس کی اسے شکایت تھی اور جس کے خلاف اس نے جدو جہد کا آغاز کیا تھا۔ اسلام مظلوم کے اس حق کو تو تسلیم کرتا ہے کہ وہ ظالم سے انتقام لے سکتا ہے، لیکن اس بات کی وہ تاکید کرتا ہے کہ جتنی زیادتی ہوئی ہے اتنا ہی انتقام لیا جاسکتا ہے، اس سے زیادہ کی کسی حال میں اسے اجازت نہیں ہے۔ ظلم و زیادتی کی بہت سی شکلیں ہیں، لیکن ان سب کو دو بڑے عنوانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ زیادتی ہے جو انسان کے جسم و جاں اور مال کے ساتھ کی جائے اور اسے جسمانی یا مالی نقصان پہنچایا جائے۔ دوسرے وہ زیادتی جو زبان سے سرزد ہوتی ہے۔ جیسے بدگوئی، زبان درازی وغیرہ۔ قرآن وحدیث میں اصولی طور پر اور عمومی انداز میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ آدمی کے ساتھ جس حد تک زیادتی ہوئی ہے، انتقام میں وہ اس سے آگے نہ بڑھے۔ لیکن کہیں اصلاً مالی اور جسمانی زیادتی کا ذکر ہے اور کہیں زبانی زیادتی کا۔ اب ہم ان دونوں ہی پہلوؤں پر الگ الگ کسی قدر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

مالی اور جسمانی انتقام میں زیادتی نہ ہو

قرآن مجید نے ایک جگہ انتقام کی اجازت دیتے ہوئے ہدایت فرمائی ہے:

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ○ (البقرہ:۱۹۴)

جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اسی جیسی زیادتی کرو جیسی کہ اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان لو کہ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی نافرمانی سے بچتے ہیں۔

یہ آیت جہاد کے سلسلہ میں آئی ہے کہ جو مہینے محترم ہیں ان کے احترام کو نظر انداز کر کے مشرکین تم سے جنگ کریں تو تمھیں بھی اسی نسبت سے جواب دینے کا

حق ہے۔ علامہ ابو بکر جصاص حنفیؒ اس سیاق و سباق کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"آیت کے الفاظ میں عموم پایا جاتا ہے۔ اس لیے اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جو شخص کسی کا مال تلف کردے تو اس پر اس کا 'مثل' واجب ہوگا۔ 'مثل' کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اسی کی جنس سے ہو۔ یہ ان چیزوں میں ممکن ہے جو ناپی یا تولی جاسکتی ہیں۔ دوسری صورت 'مثل' کی قیمت ہے۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ اگر کسی غلام کے دو آقا ہوں۔ ان میں سے ایک اپنا حصہ آزاد کردے اور دوسرا آزاد نہ کرے تو جو آزاد کرے وہ صاحب حیثیت ہو تو دوسرے کے حصہ کی قیمت کی ضمانت لے گا (اس طرح غلام آزاد ہوجائے گا) اس میں آپ نے آزاد کرنے والے پر جو 'مثل' لازم آتی ہے اسے قیمت کی شکل میں متعین فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیمت کو بھی 'مثل' کہا جا سکتا ہے۔ 'مثل' اس چیز کو بھی کہا جاسکتا ہے جو کسی عمل کی مناسب جزا بن جائے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کسی پر تہمت لگائے تو جواب میں اس پر اسی طرح کی تہمت تو نہیں لگائی جاسکتی البتہ اسے اسّی۸۰ کوڑے لگائے جائیں گے۔ تہمت کی یہ سزا اس کا 'مثل' ہے۔"[۱]

ایک دوسرے مقام پر قرآن میں ہے:

وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۖ وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ	اور اگر بدلہ لو تو اسی قدر بدلہ لو جس قدر کہ تم پر زیادتی ہوئی ہے، لیکن اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہتر ہے۔ (النحل:۱۲۶)

یہ آیت دعوت و تبلیغ کے اصول و آداب کے ذیل میں آئی ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں: "دین کی دعوت دینے والے کو اس کے مخالفین قتل کرنے کی بھی کوشش کرسکتے ہیں۔ زدو کوب اور سب و شتم کا بھی امکان ہے۔ اس وقت داعی کے اندر اس کا جواب دینے اور مقابلہ کرنے کا جذبہ ابھر سکتا ہے۔ اس لیے ہدایت کی گئی کہ اس صورت

---

۱ احکام القرآن للجصّاص: ۱/۳۰۵-۳۰۶

میں وہ عدل و انصاف پر قائم رہے اور ظلم و زیادتی کی راہ نہ اختیار کرے۔"[1]

یہاں بھی قرآن مجید نے انتقام میں 'مثل' کی شرط لگائی ہے۔ یعنی جتنی زیادتی ہوئی ہے اتنا ہی بدلہ لیا جاسکتا ہے۔ فقہاء نے اس سے بعض قانونی تفصیلات اخذ کی ہیں۔ ابوبکر جصاصؒ اس سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ جو شخص کسی کو قتل کرے اسے قتل کیا جائے، جو کسی کو چوٹ پہنچائے اسے بھی اتنی چوٹ پہنچائی جائے۔ اگر کوئی شخص کسی کا ہاتھ کاٹے اور پھر اسے قتل کرے تو مقتول کے اولیاء کو یہ حق ہوگا کہ وہ بھی پہلے قاتل کا ہاتھ کاٹیں اور اس کے بعد اسے قتل کریں۔"[2]

علامہ ابوبکر جصاصؒ مزید لکھتے ہیں: "اس کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے سر کو پتھر سے کچل کر اسے ہلاک کردے یا کھڑا کر کے ناوک زنی کرے اور جان لے لے تو اس سے بالکل اسی طرح قصاص نہیں لیا جائے گا، بلکہ اسے تلوار سے قتل کیا جائے گا، اس لیے کہ اس صورت میں قاتل نے مقتول کو کتنی ضربیں لگائیں اور اسے کتنی تکلیف پہنچائی اس کا ہمیں صحیح علم نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے ٹھیک اسی طرح انتقام نہیں لیا جاسکتا۔ البتہ جان لینے کی حد تک برابری ممکن ہے۔ اس لیے تلوار سے اس کی جان لی جائے گی۔"

یہ فقہ حنفی کا مسلک ہے، لیکن دوسرے فقہاء کے نزدیک قاتل کو اسی شکل میں قتل کیا جائے گا جس شکل میں اس نے قتل کیا ہے۔ الاّ یہ کہ اس نے کسی ایسے طریقے سے قتل کیا ہو جس کا اختیار کرنا شرعاً حرام ہو۔ جیسے کسی نے شراب پلا کر یا بد فعلی کر کے مارا ہو یا آگ میں جلایا ہو۔[3]

---

[1] التفسیر الکبیر: ج ۱۰ جزء ۲۰ ص ۱۱۳

[2] ان آیات کی بنا پر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور ابو ثورؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ ابن قدامہ، المغنی: ۷/ ۶۸۵

[3] ملاحظہ ہو ابن عربی مالکی احکام القرآن: ۳/ ۱۱۹۰۔ نیل الاوطار: ۷/ ۱۶۴-۱۶۷

علامہ ابو بکر جصاص حنفیؒ کہتے ہیں: ''اگر کوئی شخص کسی کا مال تلف کردے تو اسے اسی طرح کا تاوان دینا ہوگا۔ اگر وہ زمین کا کچھ حصہ اپنی عمارت میں شامل کرلے یا گیہوں غصب کرکے پسوالے تو بھی اس کا 'مثل' واجب ہوگا۔ گیہوں اسی مقدار میں واجب ہوگا جس مقدار میں غصب کیا گیا ہے اور زمین کے معاملہ میں قیمت واجب ہوگی۔

جس نے دوسرے کی زمین پر قبضہ کرکے عمارت بنالی ہے اسے منہدم کرکے مظلوم کو اس کی جگہ بھی دلوائی جاسکتی ہے، لیکن جصاصؒ کہتے ہیں یہ 'مثل' نہیں ہے۔ بعینہ اسی چیز کا واپس کرنا ہے[1]

بلاشبہ اسے 'مثل' تو نہیں کہا جاسکتا۔ پھر بھی یہ بات قابل غور ہے کہ بعض اوقات مظلوم کے حق میں اس کی چھنی ہوئی زمین کا اسے مل جانا ہی قیمت کے مقابلے میں زیادہ مفید ہوسکتا ہے۔

زبان سے انتقام میں زیادتی نہ کی جائے

اس بحث کا تعلق اصلاً جانی اور مالی زیادتیوں سے ہے۔ اب زبان سے ہونے والی زیادتیوں کو لیجیے۔ ایک شخص کسی کو اپنی زبان سے تکلیف پہنچائے تو اسے بھی صرف اسی حد تک انتقام لینے کی اجازت ہے جس حد تک اسے تکلیف پہنچائی گئی ہے۔ اسی بحث کے ذیل میں یہ آیت گزرچکی ہے۔

لاَ یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلاَّ مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا○ — اللہ کو پسند نہیں کہ کسی بری بات کا برملا ذکر کیا جائے۔ لیکن جس شخص پر ظلم ہو (وہ اس کا اظہار کرسکتا ہے) اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (الشوریٰ:۳۹)

اس میں جہاں مظلوم کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا برملا اظہار کرسکتا ہے وہیں یہ حقیقت واضح کرکے کہ اللہ سمیع و علیم ہے اس حق کے غلط استعمال

---

[1] احکام القرآن للجصّاص: ۳/۲۳۹-۲۴۰

سے منع بھی کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ ان الفاظ کو بھی سن رہا ہے جو تمھاری زبانوں سے نکلتے ہیں اور ان جذبات و احساسات سے بھی واقف ہے جو تمھارے سینوں میں چھپے ہوئے ہیں، اس لیے اگر تم نے اپنے جائز حدود سے باہر قدم رکھا تو وہ تمھاری گرفت کرسکتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے سمیع و علیم ہونے کا ذکر کر کے حق انتقام کے غلط استعمال اور ظالمانہ روش اختیار کرنے سے باز رکھا گیا ہے۔ امام رازیؒ اس جگہ ان صفات کی معنویت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آیت میں مظلوم کو جس ظلم کے اظہار و اعلان کی اجازت دی گئی ہے، ان صفات کے ذکر کے ذریعہ، اس میں حد سے بڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی اللہ سے ڈرے اور صرف حق بات کہے اور کسی پر تہمت نہ لگائے، ورنہ وہ معصیت کا مرتکب ہوگا۔ جو کچھ وہ کر رہا ہے اللہ اسے سن رہا ہے اور جو کچھ اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہے اسے وہ جانتا ہے۔''[1]

حدیث میں یہ بات زیادہ وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ چناں چہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المستبّان ما قالا فعلی البادی ما لم یعتد المظلوم[2]	ایک دوسرے کو سب و شتم کرنے والوں نے جو کچھ کہا اس کا گناہ ابتدا کرنے والے پر ہے۔ جب تک کہ مظلوم (جواب میں) حد سے آگے نہ بڑھے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ انتقام لینا جائز ہے۔ اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس پر کتاب و سنت کے بہ کثرت دلائل موجود ہیں۔''[3]

---

[1] التفسیر الکبیر: ج۶ جزء ۱۱ص ۳۷

[2] مسلم: کتاب البر والصلۃ، باب النہی عن السباب

[3] شرح مسلم جلد: ۸، جزء: ۱۶، ص ۱۱۵، ۱۱۶

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"اثبت للمظلوم انتصارا الی ان یعتدی۔"[۱] (اس حدیث میں آپؐ نے مظلوم کے لیے انتقام کے حق کا اثبات فرمایا ہے۔ جب تک کہ وہ زیادتی نہ کرے)۔

انتقام میں حدود شریعت کی پابندی

اسلام نے انتقام میں ایک شرط تو یہ رکھی ہے کہ وہ اسی حد میں ہوگا جس حد میں کہ زیادتی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص طمانچہ رسید کرے تو اس کی جان لے لی جائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی انتقام میں اخلاق اور حدود شریعت کا پابند رہے۔ اس سے تجاوز نہ کرے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں۔

"کسی مسلمان کے ساتھ زبان درازی اور سب و شتم کرنا حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "مسلمان کو گالی دینا فسق ہے۔" اگر کسی کے ساتھ دشنام طرازی کی جائے تو اسے اسی طرح کے الفاظ میں جواب دینے کا حق ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ جواب دینے والا کذب بیانی نہ کرے، تہمت نہ لگائے اور اس کے اسلاف کو برا بھلا نہ کہے۔ جواب دینے کی بعض جائز صورتیں یہ ہوسکتی ہیں کہ وہ اس کے لیے ظالم، احمق یا دشمنِ جان جیسے الفاظ استعمال کرے۔ اس لیے کہ ان کا اطلاق ہر شخص پر ہوسکتا ہے۔ کوئی بھی ان کم زوریوں سے پاک نہیں ہے۔ مظلوم نے اس طرح جواب دے دیا تو گویا ظالم سے پورا بدلہ لے لیا۔ دشنام طرازی کرنے والے پر اس کا جو حق تھا وہ اس نے وصول کرلیا۔ البتہ جس نے اس کی ابتدا کی اس پر اس کے ابتدا کرنے کا گناہ ضرور ہوگا۔ اس پہلو سے بھی وہ گناہ گار قرار پائے گا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کی نافرمانی کی۔ اس کے لیے اللہ سے اسے استغفار کرنی ہوگی۔ بعض لوگوں کی رائے یہ بھی ہے کہ مظلوم نے جب بدلہ لے لیا تو یہ ساری باتیں از خود ختم ہوگئیں۔"[۲]

---

[۱] احیاء علوم الدین: ۳/۱۲۴

[۲] شرح مسلم حوالہ سابق، ص ۱۱۶

امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

''ہر ایک ظلم کے جواب میں اسی طرح کی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ غیبت کے جواب میں غیبت، تجسس کے جواب میں تجسس، دشنام طرازی کے جواب میں دشنام طرازی صحیح نہیں ہے۔ یہی معاملہ تمام معصیتوں کا ہے کہ ان کے جواب میں اسی طرح کی معصیتوں کا ارتکاب نہیں کیا جاسکتا۔ قصاص اور تاوان بھی اسی حد تک لیا جائے گا جس حد تک کہ شریعت نے اجازت دی ہے۔''[۱]

اسی ذیل میں عفو و درگزر کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جن لوگوں نے انتقام کو جائز قرار دیا ہے انھوں نے شرط یہ رکھی ہے کہ آدمی جھوٹ اور غلط بیانی سے کام نہ لے۔ زیادتی کرنے والے کے لیے آدمی اس طرح کے الفاظ اور جملے استعمال کرسکتا ہے جیسے اے فلاں کی اولاد، احمق، بدخلق، لوگوں کی عزت و آبرو سے کھیلنے والا، اگر حیا ہوگی تو نہیں بولو گے، اللہ تمھیں ذلیل اور رسوا کرے، تم اپنی حرکتوں کی وجہ سے میرے نزدیک بالکل حقیر ہو، وغیرہ۔ باقی رہا چغلی، غیبت، کذب و افترا، اس کے ماں باپ کو برا بھلا کہنا تو یہ بالاتفاق سب کے نزدیک حرام ہے۔''[۲]

یوں کہا جاسکتا ہے کہ مظلوم کو انتقام کا حق ضرور حاصل ہے۔ لیکن یہ حق غیر مشروط اور مطلق نہیں ہے، بلکہ کچھ حدود و قیود کا پابند ہے۔ اگر مظلوم ان حدود کو توڑ کر انتقامی کارروائی کرنے لگے تو اسلام کی نظر میں وہ خود بھی ظالم کی صف میں شامل ہوجائے گا اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو کسی ظالم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

۱۔ احیاء علوم الدین: ۳/۱۵۵

۲۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ''سب وشتم کا جواب دیا جاسکتا ہے، لیکن جواب نہ دینا افضل ہے۔ اس لیے کہ ان حدود کی پابندی بہت مشکل ہے۔ اس کے مقابلہ میں آسان یہ ہے کہ آدمی سکوت اختیار کرے۔'' (حوالہ سابق ص ۱۵۷) عفو و درگزر کی فضیلت اور انتقام کے حدود کو ماننے کے باوجود حق انتقام بہ ہر حال باقی رہے گا اور اس کے استعمال پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔

عفو و درگزر کا حق

جس شخص کے ساتھ ظلم و زیادتی ہو اسے عفو و درگزر کا بھی حق ہے۔ شاید زیادہ صحیح تعبیر یہ ہو کہ انتقام ایک قانونی حق ہے اور عفو و درگزر اس سے دست بردار ہو جانے کا نام ہے۔ امام غزالیؒ عفو کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

العفو ان یستحق حقا فیسقطه و یبری عنه من قصاص او غرامة[1]	عفو یہ ہے کہ آدمی کسی حق کا حق دار ہو اور اسے ساقط کر کے (مجرم کو) قصاص یا تاوان سے بری کر دے۔

معاف، کرنا پسندیدہ ہے

قرآن مجید نے عفو و درگزر کو ایک پسندیدہ عمل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ صرف یہی نہیں کہ ظلم کا بدلہ لینے میں حد سے آگے بڑھنے سے روکتا ہے، بلکہ عفو و درگزر کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ مظلوم کے اس حق کو تو تسلیم کرتا ہے کہ وہ ظالم سے انتقام لے سکتا ہے، لیکن اسے اخلاق کی اس بلندی پر دیکھنا چاہتا ہے جہاں انسان بڑے سے بڑے ظلم کو بھول کر حسنِ سلوک کرنے لگتا ہے۔ اسے وہ نتائج کے لحاظ سے انتقام کے مقابلہ میں مفید اور بہتر سمجھتا ہے۔ یہ آیت اوپر گزر چکی ہے۔ دوبارہ اس کے الفاظ پر غور فرمائیے۔

وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ o (النحل:۱۲۶)	اور اگر بدلہ لو تو اسی قدر بدلہ لو جس قدر کہ تم پر زیادتی ہوئی ہے۔ لیکن اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہتر ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: ''آیت میں قصاص لینے میں عدل اور برابری کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کسی کی کوئی چیز چھین لی جائے تو اسے لینے میں مماثلت ہونی چاہیے۔'' مزید کہتے ہیں: یہ اور اس طرح کی دوسری آیتوں میں عدل کو قانون اور شریعت کا درجہ دینے کے ساتھ فضل و احسان کی ترغیب دی گئی ہے۔''[2]

---

[1] احیاء علوم الدین: ۱۵۷/۳

[2] تفسیر ابن کثیر: ۵۹۲/۲

جصاص کہتے ہیں: ''آیت بتاتی ہے کہ قاتل اور زیادتی کرنے والے سے انتقام لینے سے افضل یہ ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔''[۱]

عفو اللہ کے نیک بندوں کی صفت

اللہ کے نیک بندوں میں بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں۔ ان کی ایک بڑی خوبی کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط — وہ غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ (آل عمران:۱۳۴)

معاف کرنے والوں کو اللہ معاف کرتا ہے

اس دنیا میں انسان سے بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ان غلطیوں کو معاف فرماتا رہتا ہے۔ اگر وہ اس کی ہر غلطی پر گرفت کرے تو اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کے اندر بھی عفو و درگزر کی یہی خوبی دیکھنا چاہتا ہے۔ ایک انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے ساتھ جو روش اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ خود اس کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ کرتا ہے۔ اس لیے اگر وہ دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرے تو امید ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم کا مستحق ہوگا اور وہ اس کی خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر فرمائے گا۔ مظلوم کو ظالم کے خلاف آواز اٹھانے کا قرآن مجید نے جہاں حق دیا ہے وہیں یہ بات اس طرح کہی ہے۔

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا○ — اگر تم کوئی بھلائی علانیہ کرو یا اسے خفیہ انجام دو یا برائی کو معاف کر دو تو (یہ بڑی خوبی کی بات ہے) بے شک اللہ تعالیٰ بھی بڑا معاف کرنے والا اور قدرت والا ہے۔ (النساء:۱۴۹)

---

[۱] احکام القرآن: ۳/۲۴۰

ایک جگہ معاشرتی احکام کے ذیل میں فرمایا۔

وَ اِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (التغابن:۱۴)	اگر تم معاف کردو اور درگزر کر جاؤ اور بخش دو تو اللہ تعالیٰ (بھی) بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

غصہ اور انتقام کے جذبہ کے تحت بعض اوقات انسان بڑے سخت اقدامات کر گزرتا ہے جو جائز ہونے کے باوجود پسندیدہ نہیں کہے جاسکتے۔ سورۂ نور میں ان سے باز رہنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا گیا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمھیں اپنے عفو و کرم سے نوازے تو اس کے بندوں کی زیادتیوں سے درگزر کرو۔ دیکھیے کتنا پیارا انداز ہے۔

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (النور:۲۲)	تم میں سے جو لوگ بزرگی اور وسعت والے ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ قرابت داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہیں کریں گے۔ انھیں معاف کردینا اور درگزر کردینا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمھیں معاف کردے اللہ غفور و رحیم ہے۔

اس آیت کے شانِ نزول میں ایک بڑا ہی موثر واقعہ حدیث کی کتابوں میں بیان ہوا ہے۔ حضرت مسطحؓ ایک نادار شخص تھے۔ بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ مکہ میں وہ اور ان کی ماں اسلام لے آئے۔ مدینہ ہجرت کی۔ بدر میں شریک ہوئے۔ نیک اور مخلص صحابی تھے۔ حضرت ابو بکرؓ سے ان کی قرابت تھی۔ ان کی غربت، افلاس اور قرابت داری کی وجہ سے حضرت ابو بکرؓ ان کے اخراجات اٹھاتے تھے۔ اپنے اخلاص کے باوجود واقعۂ افک کے سلسلے میں ان سے چوک ہوگئی۔ حضرت عائشہؓ ایک غزوہ میں جب پیچھے رہ گئیں اور ایک صحابی کے ساتھ واپس آئیں تو اس پر منافقین نے

چہ می گوئیاں شروع کردیں اور بعض نے تہمت لگادی۔ یہ بھی اپنی سادگی میں اس سے متاثر ہوگئے۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ فرمایا: خدا کی قسم اب آئندہ کبھی اس شخص پر اپنا پیسہ نہیں خرچ کروں گا۔ روایتوں میں آتا ہے کہ اسی کے بعد سورہ نور کی مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے آیت سنی تو فرمایا:

واللہ انی لاحب ان یغفر اللہ لی	اللہ کی قسم میں تو یہی چاہتا ہوں کہ اللہ میرے گناہوں کو معاف کردے۔

اس کے بعد حضرت مسطحؓ کا خرچ دوبارہ دینے لگے۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اسے دوگنا کردیا اور کہا کہ اب کبھی ان کا خرچ بند نہیں کروں گا۔[1]

حدیث میں درگزر کی ترغیب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں عفو و درگزر کی بڑی ترغیب اور فضیلت بیان ہوئی ہے اور اس پر مختلف پہلوؤں سے ابھارا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ما نقصت صدقة من مال وما زاد اللّٰہ عبداً بِعفوٍ الاّ عزاً وما تواضع احد للّٰہ الا رفعه اللّٰہ[2]	صدقہ و خیرات سے مال میں کبھی کمی نہیں آتی۔ عفو و درگزر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندہ کی عزت ہی میں اضافہ فرماتا ہے اور جو اللہ کے لیے تواضع اور خاک ساری اختیار کرے وہ اسے رفعت اور سربلندی عطا کرتا ہے۔

اسی مفہوم کی ایک روایت ابوکبشہ انماریؓ سے آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا:

۱۔ بخاری: کتاب التفسیر (سورۃ النور) مع فتح الباری: ۸/ ۳۳۸

۲۔ مسلم: ابواب البر والصلہ، باب استحباب العفو والتواضع

ما نقص مال عبد من صدقة ولا ظلم عبد مظلمة صبر عليها الا زاده الله عزا ولا فتح عبدٌ باب مسئلةٍ الا فتح الله عليه باب فقرٍ[1]

صدقہ سے بندے کا مال کم نہیں ہوتا، کسی بندہ پر ظلم ہو اور وہ اس پر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی عزت میں اضافہ کرتا ہے، جو شخص سوال کا دروازے کھولے (مانگنا شروع کردے) تو اللہ اس پر لازماً فقر و احتیاج کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

عقبہ بن عامرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

صل من قطعك واعط من حرمك واعف عمن ظلمك[2]

جو تم سے قطع تعلق کرے اس سے تعلق جوڑو، جو تمھیں تمھارے (حق سے) محروم کرے اسے (اس کا حق دو) اور جو تم پر زیادتی کرے اسے معاف کردو۔

غصہ پر قابو پانے کی فضیلت

انتقام کا بڑا محرک انسان کا غیظ و غضب ہے۔ جب کسی کے خلاف اس کے اندر جذبات غضب بھڑکتے ہیں تو وہ انتقام کے ذریعہ انھیں بجھانا چاہتا ہے۔ اس محرک پر محض اللہ کی رضا جوئی کے خاطر قابو پانا اور غصہ کو پی جانا بہت بڑا کارثواب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ما من جرعة اعظم اجرًا من جرعة غيظ كظمها عبد ابتغاء وجه الله[3]

غصہ کے اس گھونٹ سے بڑے اجر والا کوئی دوسرا گھونٹ نہیں ہے، جسے بندہ اللہ کی رضا کے لیے پی جائے۔

انتقام کی طاقت رکھنے کے باوجود اگر آدمی درگزر سے کام لے تو اس کا اجر و

---

[1] ترمذی، ابواب الزہد، باب ماجاء مثل الدنیا

[2] مسند احمد: ۱۴۸،۴/ ۱۵۸ قال المنذری رواہ احمد والحاکم ورواۃ احدی اسناد احمد ثقات الترغیب والترہیب: ۲۳۲/۳۔ اس کے ہم معنی اور روایات بھی الترغیب والترہیب میں موجود ہیں۔

[3] ابن ماجہ، ابواب الزہد، باب الحلم۔ مسند احمد: ۱۲۸/۲

ثواب بھی اتنا ہی بڑا ہے۔ حضرت معاذ بن انس جہنیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من کظم غیظا و هو قادر علی ان ینفّذه دعاه اللّٰه یوم القیامة علی رؤس الخلائق حتی یخیره فی ای الحور شاء [۱]

جو شخص غصہ کو پی جائے جب کہ وہ اس کے مطابق اقدام کرنے پر قادر ہو تو اللہ تعالیٰ اسے ساری مخلوقات کے سامنے بلائے گا اور اسے اختیار دے گا کہ وہ جس حور کا چاہے انتخاب کرلے۔

غصہ کسی ناگواری کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اس تلخ گھونٹ کو پی کر انسان اس کے بے پایاں کرم کا مستحق ہوتا ہے۔

عفو و انتقام کی اہمیت موقع و محل کے لحاظ سے

قرآن و حدیث کی رو سے جب اخلاق کی بلندی یہ ہے کہ آدمی غصہ کو پی جائے اور ظلم کو معاف کردے تو پھر انتقام کا ذکر اہل ایمان کے ایک بہتر وصف کی حیثیت سے کیوں کیا گیا؟ کیا ان دونوں باتوں میں تضاد نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی زندگی انتقام اور عفو و درگزر دونوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ کبھی انتقام کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی تقاضا ہوتا ہے کہ عفو و درگزر سے کام لیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنے موقع و محل کے لحاظ سے اہمیت ہے۔ جہاں انتقام لینا چاہیے وہاں درگزر کی تعریف نہیں کی جاسکتی اور جس جگہ درگزر مطلوب ہو وہاں انتقام کو پسندیدہ نہیں کہا جاسکتا۔

علامہ ابو بکر جصاصؒ کہتے ہیں: ''عفو و درگزر اس موقع کے لیے ہے جب کہ مجرم اپنی حرکت پر نادم ہو اور اس سے باز آجائے، باقی رہا وہ شخص جو ظلم و عدوان پر اصرار کرے اس سے انتقام لینا ہی بہتر ہے۔'' [۲]

---

[۱] ابو داؤد، کتاب الادب، باب من کظم غیظا۔ ترمذی، ابواب البر والصلہ، باب ماجاء فی کثرۃ الغضب۔ یہ حدیث سنداً کم زور ہے۔ الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۳۰۲۔

[۲] احکام القرآن: ۳/۴۷۵

امام رازیؒ فرماتے ہیں: ”عفو و درگزر کا نتیجہ دوشکلوں میں ظاہر ہوسکتا ہے۔ ایک یہ کہ فتنہ دب جائے اور مجرم اپنی غلطی سے رجوع کرلے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مجرم کی ہمت بڑھے، اس کے غیظ وغضب میں اضافہ ہو اور وہ مزید غلط کاری کرنے لگے۔ عفو و درگزر کا ثواب پہلی صورت میں ہے۔ دوسری صورت میں انتقام پسندیدہ ہے۔“[۱]

علامہ ابو السعودؒ کہتے ہیں: ”اہل ایمان کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ان لوگوں سے بدلہ لیتے ہیں جو ان کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ معاف کردیتے ہیں۔ ان دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے ہر وصف اپنی جگہ پسندیدہ ہے۔ لیکن جب اسی کو دوسرے کی جگہ اختیار کیا جائے تو وہ قابل مذمت اور ناپسندیدہ ہوجاتا ہے۔“[۲]

درگزر کرنا مظلوم کا اختیاری حق ہے

ظالم کو معاف کرنے کا حق کیا صرف مظلوم کو ہے یا حکومت اور ریاست بھی اسے معاف کرسکتی ہے۔ دنیا نے ہمیشہ حکومت اور ریاست کو بڑے سے بڑے ظالم کو معاف کرنے کا حق دیا ہے۔ اسی بنا پر اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کرے اور حکومت اسے معاف کردے تو مظلوم کو انتقام لینے یا انصاف چاہنے کا حق باقی نہیں رہتا۔ لیکن یہاں دو باتیں قابل غور ہیں: ایک یہ کہ جس طرح مظلوم اپنے نفع و نقصان کو محسوس کرسکتا ہے، اس طرح کوئی دوسرا فرد یا ادارہ اسے محسوس نہیں کرسکتا۔ اس لیے فطری طور پر عفو و درگزر اور انتقام کا حق اسی کو ملنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ حکومت نے عفو و درگزر کے اختیار کو بالعموم غلط طریقے سے استعمال کیا ہے اور جن افراد کو حکومت کی پشت پناہی حاصل رہی ہے انھوں نے کم زوروں پر بے پناہ مظالم کیے ہیں۔ اسلام کے نزدیک عفو و درگزر کا تعلق اس شخص

---

[۱] تفسیر کبیر: جلد ۱۴، جزء ۲۷، ص ۱۵۲

[۲] تفسیر ابو السعود: ۷/ ۲۶۹

سے ہے جس پر زیادتی ہوئی ہے۔ وہی اسے معاف کرسکتا ہے۔ اگر کسی نے کسی پر دست درازی کی ہے تو اسے انتقام کا حق بھی حاصل ہے اور معافی کا حق بھی۔ اس کے اس حق کو کوئی دوسرا شخص یا ادارہ چاہے وہ حکومت ہی کیوں نہ ہو چھین نہیں سکتا۔"[۱]

خلاصۂ بحث

اسلام کے نزدیک مظلوم کو ظلم کے انتقام اور عفو و درگزر دونوں کا اختیار ہے۔ وہ اگر انتقام لے تو اپنے ایک قانونی حق کا استعمال کرتا ہے۔ قانون صرف یہ دیکھے گا کہ وہ انتقامی کارروائی میں شریعت کے حدود سے آگے نہ بڑھے۔ اور معاف کردے تو یہ اس کا احسان ہے، اور احسان پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ کسی کے قانونی حق کو تسلیم کرکے معافی کی درخواست کرنے اور اسے اس حق سے بالکلیہ محروم کردینے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلی صورت اس کے اندر بلند حوصلگی اور عالی ظرفی پیدا کرتی ہے اور دوسری سے اس کی خودی مٹتی اور وہ ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے اس مسئلہ کے سارے اخلاقی اور قانونی پہلوؤں کو سورۂ شوریٰ کی تین آیتوں میں سمیٹ دیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ؕ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَ لَمَنْ

(ایمان والے وہ ہیں کہ)...... جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے۔ پھر جو شخص معاف کردے اور اصلاح کرے اس کا اجر و ثواب اللہ کے ذمہ ہے، بے شک اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ جو لوگ اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جاسکتی۔ ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ان کے لیے دردناک

---

[۱] اس سے وہ حدود مستثنیٰ ہیں جنھیں وہ شخص بھی معاف نہیں کرسکتا جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔

صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ | عذاب ہے۔ جو شخص صبر کرے اور معاف کردے تو یہ بڑی اولو العزمی کے کاموں میں سے ہے۔ (الشوریٰ: ۳۹-۴۱)

اسلام نے مظلوم کو قانونی لحاظ سے اتنا مضبوط مقام عطا کیا ہے کہ وہ کسی خارجی دباؤ کے بغیر اپنی آزاد مرضی سے ظلم کے خلاف جوابی کارروائی کرسکتا ہے۔ وہ زندگی کے کسی بھی مرحلے میں بے بسی اور بے چارگی کے احساس سے دو چار نہیں ہوتا کہ اس کے حقوق غیر محفوظ ہیں اور وہ کسی جابر و قاہر کے ظلم کا نشانہ بن سکتا ہے۔ اس کے ساتھ اسلام مظلومیت کے نام پر کسی کو جائز حدود سے آگے بڑھنے سے منع کرتا ہے اور اس کے اندر وہ اخلاق کی بلندی پیدا کرتا ہے جو اسے فرشتوں سے ہم کنار کردے۔

کتاب کے مآخذ

کتاب میں جن مآخذ کا حوالہ دیا گیا ہے، ذیل میں ان کے مصنّفین، مطابع اور سنین طباعت کی تفصیل دی جا رہی ہے۔ البتہ حدیث کی جن کتابوں کے حوالے کتب و ابواب کی صراحت کے ساتھ دیے گئے ہیں ان کے سلسلے میں اس تفصیل کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	مطبع و سنہ طباعت
۱-		قرآن کریم (منزل من اللہ)	

تفسیر

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	مطبع و سنہ طباعت
۲-	فخر الدین محمد الرازی	مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)	دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان ۱۹۹۰ء
۳-	عماد الدین اسماعیل (ابن کثیر)	تفسیر القرآن العظیم	مطبع مصطفیٰ احمد مصر ۱۳۵۶ھ
۴-	محمد حسین بن مسعود الفراء (البغوی)	معالم التنزیل	دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان ۱۹۹۵ء
۵-	علاء الدین علی بن محمد ابراہیم البغدادی (الخازن)	لباب التاویل فی معانی التنزیل المعروف بالتفسیر الخازن	دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان ۱۹۹۵ء
۶-	ابو جعفر محمد بن جریر (الطبری)	جامع البیان فی تاویل آی القرآن (تفسیر طبری)	المطبعۃ المیمنیۃ، مصر ۱۳۲۱ھ

نمبر	مصنف	کتاب	مطبع
۷-	ابو السعود العمادی الحنفی (م۹۸۲ھ)	ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم	علی ھامش التفسیر الکبیر للرازی المطبعۃ العامرۃ، مصر ۱۳۰۸ھ
۸-	ابو الفضل شہاب الدین السید محمود آلوسی البغدادی (م۱۲۷۰ھ)	روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی	ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر
۹-	السید رشید رضا مصری (م۱۹۳۵ء)	تفسیر المنار	مطبعۃ المنار، مصر ۱۳۶۵ھ

حدیث

نمبر	مصنف	کتاب	مطبع
۱۰-	محمد بن اسماعیل (البخاری)	صحیح بخاری	
۱۱-	ابو الحسین مسلم بن الحجاج	صحیح مسلم	
۱۲-	سلیمان بن اشعث السجستانی	سنن ابی داؤد	
۱۳-	ابوعیسیٰ الترمذی	جامع الترمذی	
۱۴-	ابوعبد الرحمٰن احمد بن اشعث النسائی	سنن النسائی	
۱۵-	ابوعبد اللہ ابن ماجہ	سنن ابن ماجہ	
۱۶-	ابوعبد اللہ مالک بن انس	المؤطا	
۱۷-	احمد بن حنبل	المسند	المطبعۃ المیمنیۃ، مصر ۱۳۱۳ھ
۱۸-	عبد العظیم بن عبد القوی (المنذری)	الترغیب والترہیب من الحدیث الشریف	دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان ۱۹۹۶ء
۱۹-	ولی الدین محمد بن عبد اللہ (الخطیب التبریزی)	مشکوٰۃ المصابیح	
۲۰	محی الدین ابو زکریا یحیٰ (النووی)	ریاض الصالحین	دار الثقافۃ العربیۃ، دمشق/بیروت ۱۹۹۱ء

شروح الحدیث

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر
۲۱-	محی الدین ابوزکریا یحییٰ النووی	شرح صحیح مسلم	دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان ۱۴۱۵ھ
۲۲-	شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی (ابن حجر العسقلانی)	فتح الباری بشرح صحیح البخاری	المطبعۃ الخیریۃ، مصر ۱۳۲۹ھ
۲۳-	عبد الرؤف المناوی	التیسیر بشرح الجامع الصغیر	دار الطباعۃ العامرۃ، مصر ۱۲۸۶ھ
۲۴-	محمد بن علی بن محمد (الشوکانی)	نیل الاوطار شرح منتقیٰ الاخبار	ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، مصر ۱۳۴۴ھ
۲۵-	عز الدین عبد اللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن الملک	مبارق الازہار شرح مشارق الانوار	مطبعۃ احمد کامل آفندی، مصر ۱۳۲۹ھ
۲۶-	ابن دقیق العید المتوفیٰ ۷۰۲ھ	اِحکام الاَحکام شرح عمدۃ الاحکام	ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر

فقہ وفتاویٰ

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر
۲۷-	برہان الدین علی بن ابی بکر (المرغینانی)	الھدایۃ (شرح بدایۃ المبتدی)	مطبع مجتبائی، دہلی ۱۹۳۱ء
۲۸-	محمد علاء الدین الحنفی	الدر المختار شرح تنویر الابصار	دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان ۱۹۹۵ء
۲۹-	محمد امین الشہیر (بابن عابدین)	رد المحتار علی الدر المختار	دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان ۱۹۹۵ء
۳۰-	ابوعبد اللہ بن احمد بن محمد (ابن قدامۃ المقدسی)	المغنی علی مختصر ابی القاسم الخرقی	مکتبۃ الریاض ۱۹۸۱ء
۳۱-	تقی الدین احمد (ابن تیمیۃ الحرانی)	مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ	دار العربیۃ، بیروت ۱۳۹۸ھ